مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپے — فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۶، عدد ۱۔ ماہ صفر المظفر ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

علامہ شبلیؒ ملک کے بہت ممتاز عالم ادیب و انشا پرداز اور اردو کے مشہور و مقبول مصنف تھے ممکن ہے بعض حیثیتوں سے دوسروں کو ان پر مزیت حاصل رہی ہو وہ خود بھی مولانا محمد حسین آزاد کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہتے تھے لیکن تعصب اور ادبی گروپ بندی سے الگ ہوکر اگر دیکھا جائے تو مجموعی حیثیت سے علامہ کا رتبہ ان کی جامعیت کی وجہ سے اردو کے عناصر خمسہ میں سب سے بلند نظر آئے گا۔

قمریاں پاس غلط کردہ خود می دارند　　ورنہ یک سرو دریں باغ باندام تو نیست

اس مسلمہ علمی و ادبی عظمت کے باوجود حاشیہ بساط نشینان شبلی نے انکو اور انکی تصنیفات کو اخطار و اغلاط سے خالی نہیں سمجھا انکے خاص شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ کو بھی جن پر انکی بیجا مداحی کا الزام عائد کیا گیا ہے انکی بعض تحقیقات سے اختلاف رہا اور انہیں اپنے استاد کے بعض خیالات کی وضاحت و تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی۔

لیکن دنیا کے اکثر عبقریوں اور نابغہ روزگار اشخاص کی طرح علامہ شبلی کو بھی اپنی عبقریت اور غیر معمولی ذہانت و قابلیت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی وہ اپنے معاصرین اور کوتاہ بیں لوگوں کے محسود و مطعون رہے اور انکی مخالفتوں اور اعتراضات کا نشانہ بنے، مانا کہ کسی واقعہ کے بیان میں یا کوئی سن تاریخ لکھنے میں ان سے سہو ہوا ہو کیونکہ انکے زمانے میں وہ بہت ساری کتابیں شایع نہیں ہوئی تھیں جو اب عام ہو گئی ہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انکے بعض معاصرین نے محض رشک و حسد کی بنا پر ان پر اعتراضات کیے ہیں اور بعض کوتاہ قامت لوگوں نے اپنا قد اونچا کرنے کیلئے انکو مطعون کیا ہے یہی وجہ ہے کہ سخت اعتراضات اور شدید تنقیدوں کے باوجود علامہ شبلیؒ کی عظمت و جلالت میں فرق آیا اور نہ انکی تصنیفات کی شہرت و مقبولیت میں کمی آئی سیرۃ النبی اور الفاروق سے لیکر انکی ہر ہر کتاب پر خواہ مخواہ نکتہ چینی کی گئی لیکن کیا ان کے شدید اعتراضات کی وجہ سے کسی کتاب کو لونی لگی؟

سب سے زیادہ علامہ شبلیؒ کی ادبی و تنقیدی کتابیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنیں، موازنہ انیس و دبیر شایع ہوئی تو مرزا دبیر کے حامی بپھر اٹھے اور موازنہ کے رد میں میر افضل علی ضو نے رد الموازنہ، حسن رضا و محمد جان عروج نے تردید الموازنہ اور نظیر الحسن فوق نے المیزان لکھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے نوک قلم سے مرزا صاحب کو جو زخم لگا وہ ہر قسم کی مرہم پٹی کے باوجود ابھی تک مندمل نہیں ہو سکا، دوسری طرف میر صاحب کے شاعرانہ کمالات و محاسن کو ابھی تک علامہ سے بہتر طور پر کوئی اور نمایاں نہیں کر سکا، علاوہ ازیں موازنہ کے رد میں لکھی جانے والی کتابیں نسیاً منسیاً ہو گئیں جبکہ موازنہ ایک سدابہار پھول کی طرح اردو شعر و ادب کے چمن کی رونق بنا ہوا ہے، ایک زمانہ میں حافظ محمود شیرانی کی تنقیدات شعر العجم کا غلغلہ مچا اور علامہ کے مخالفین نے حافظ صاحب کے فضل و کمال کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا مگر پھر

ع صبح کی بات گئی رات کا افسانہ گیا

حافظ صاحب کی تنقیدیں ذہن سے محو ہو گئیں اور شعر العجم کی بدولت ملک میں فارسی کا جو ذوق ختم ہو رہا تھا از سر نو قائم ہوا، اس میں علامہ کے قلم کی بہار آفرینی اور ذہن کی نکتہ دری نے شعر و ادب اور تنقید کا جو گلدستہ سجایا تھا وہ آج بھی مشام جاں کو معطر اور ارشاد ربانی فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ کی تفسیر کر رہا ہے۔

ماضی میں علامہ شبلی اور انکی تصانیف پر جو بیجا نکتہ چینیاں ہوئیں گو وہ اب لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکی ہیں لیکن بعض بعض حلقوں سے اب بھی انہی اعتراضات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے، مگر یہ سارے اعتراضات یا تو برائے اعتراض ہوتے ہیں یا اپنے پست قد کو بلند کرنے کیلئے۔ بلکہ بعض بدباطن لوگ تو علامہ کی یادگاروں دار المصنفین اور ندوۃ العلما کو نقصان پہونچانے کے درپے ہیں، یہ لوگ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ ان کے لغو و لاطائل اعتراضات سے علامہ کے تعلیمی نظریات منہدم ہو جائیں گے اور ان کی کتابوں کی عالمگیر شہرت و مقبولیت ختم ہو جائے گی، جس کا اثر لامحالہ ندوہ اور دار المصنفین پر بھی پڑے گا، اسی جذبہ سے بعض حضرات علامہ کے تعلیمی خیالات پر اور ایک صاحب علم و تحقیق کے نام پر ان کی سب سے مایہ ناز اور

شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی پر اعتراضات کی بوچھار کر رہے ہیں لیکن ہم ان مدعیان علم و تحقیق کا تدارک کرنے کے لیے نہ معارف کے صفحات اور نہ اپنے رفقا کا قیمتی وقت ضائع ہونے دیں گے، حیرت ہوتی ہے کہ اس ہستی کو تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے جس نے ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام کو بھی اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پر شور کر رکھا ہے۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ ذا خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے خیر خواہوں اور معارف کے قدر دانوں کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے ہمیں خوشی ہو رہی ہے کہ الحمد للہ دار المصنفین میں کمپیوٹر کتابت کا نظم قائم ہو گیا ہے جس کا افتتاح خوش قسمتی سے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے فرمایا ہے، ناظرین دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کو کامیاب اور دار المصنفین کے لیے باعث خیر و برکت بنائے، ہماری جو مطبوعات عرصہ سے دستیاب نہیں تھیں انشاء اللہ اب وہ جلد طبع ہو جائیں گی اور نئی مطبوعات اور معارف کی اشاعت میں بھی اس سے بڑی سہولت ہو جائے گی۔ لیکن کمپیوٹر، لیزر پرنٹر، ڈاٹ پرنٹر کس پیج کمپوزر وغیرہ کے اخراجات اور کاغذ کی ناقابل بیان گرانی کے باعث اسی ماہ جولائی سے معارف کا سالانہ چندہ اسی روپے کر دیا گیا ہے، اس لیے اب جن لوگوں کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے یا آئندہ ختم ہو وہ نئی شرح سے چندہ ارسال کریں، جس کی تفصیل اسی شمارہ کے ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر ملاحظہ کر لی جائے۔ چندہ منی آرڈر یا ڈرافٹ ہی سے دار المصنفین۔ شبلی اکیڈمی کے نام بھیجا جائے۔ چیک بھیجے جائیں تو بینک کا کمیشن بھی شامل کر لیا جائے، قومی انجمنوں اور عربی مدرسوں سے اکثر معارف مفت طلب کیا جاتا ہے، جس کی تعمیل سے دفتر معذور ہے، اس دفعہ فہرست مضامین کے صفحے میں اور آئندہ بعض اور صفحات میں کہیں کہیں خفیف تغیر دکھائی دے گا۔

مقالات

گجرات و احمد آباد کی مرکزیت و اہمیت اور حضرت پیر محمد شاہ [۱]

از ضیاء الدین اصلاحی

گجرات کی زرخیزی اور شادابی اور اس کی تجارتی اور کاروباری رونق اور ہما ہمی نے ہندوستان کی مختلف قوموں کو اپنی جانب مائل کیا اور سب نے یہاں اپنے ثقافتی، تمدنی اور مذہبی آثار و نقوش چھوڑے، مسلمانوں کے لیے بھی یہ خطہ بہت پرکشش اور عظمت و تقدس کا حامل رہا ہے اور انہوں نے یہاں گوناگوں علمی، تہذیبی اور مذہبی نقوش چھوڑے ہیں۔

گجرات میں مسلمانوں کی آمد عام شہرت یہ ہے کہ مسلمان سب سے پہلے بنو امیہ کے عہد میں

---

[۱] یہ مقالہ احمد آباد (گجرات) کی درگاہ پیر محمد شاہ کے سیمینار منعقدہ ۴ تا ۶ دسمبر ۹۴ء کو پڑھا گیا تھا، جس کا موضوع "ہندوستان خصوصاً گجرات کے صوفیہ کی ہندوستانی معاشرت و ثقافت کو دین" تھا۔ اس میں جن صوفیوں کا تذکرہ کیا گیا تھا ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لیے اس حصہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور صرف گجرات و احمد آباد کی عظمت و اہمیت اور حضرت پیر محمد شاہ کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون کی تیاری میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریروں سے مرآۃ احمدی اور دوسری کتابوں سے مدد لی گئی ہے (ض)

سندھ آئے لیکن فتوح و مغازی کے مصنفین کا بیان ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ان کے گورنر عثمان بن ابو العاص ثقفیؓ نے اپنے بھائی حکم بن ابو العاص ثقفیؓ سے تھانہ کی بندرگاہ پر فوج کشی کرائی، گو صوبوں کی موجودہ تقسیم نے تھانہ، کھنبایت، باہم بلکہ خود بمبئی کو جس کا اُس وقت وجود بھی نہ تھا، گجرات کے حدود سے الگ کر دیا ہے، تاہم سارے ہندوستان میں گجرات ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی وادیوں اور دشت و جبل میں سب سے پہلے توحید کی اذان گونجی اور یہی وہ سرزمین ہے جو سب سے پہلے ان نفوس قدسیہ اور شہیدان وفا کے خون سے لالہ زار ہوئی اور ان کا مدفن بنی جنھوں نے عجب نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا دیکھا ہو۔

گجرات سے مسلمانوں کے تجارتی تعلقات یہاں ان کی حکومت کے قیام کے صدیوں پہلے سے تھے جو محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد اور بڑھے۔ ۱۴۰ھ / ۷۵۷ء میں بھروچ کے قریب گندھار کی بندرگاہ میں سب سے پہلی مسجد بنی اور ۱۶۰ھ / ۷۷۶ء میں باربد میں تعمیر ہوئی۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری نے بھی اپنے زمانے میں گجرات پر فوج کشی کی لیکن سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۶ھ / ۱۳۱۷ء میں اس کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بنا دیا مگر تغلق خاندان کا زوال شروع ہوا تو اس کے ایک امیر ظفر خاں نے یہاں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر لی، گجرات کی تاریخی اہمیت اور اس کی ترقی کا اصل دور یہیں سے شروع ہوتا ہے، آل مظفر کی حکومت تقریباً دو سو برس تک رہی تا آنکہ تیموری فرماں روا جلال الدین محمد اکبر نے گجرات کو ممالک محروسہ کا حصہ بنا دیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ علاء الدین کی فتح گجرات اور ملک کافور کے حملوں سے

صدیوں پہلے گجرات کے سواحل پر مسلمان تاجروں کی نو آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، کہیں کہیں دس دس ہزار ان کی آبادی تھی، جہاں ان کے قاضی ان کے لیے فیصلے کرتے تھے، یہ ہنرمند کہلاتے تھے، ان کی مسجدیں بڑی آباد اور خانقاہیں معمور ہوتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ عربی الفاظ گجراتی میں اور گجراتی الفاظ عربی میں بکثرت رائج ہیں، جس طرح عرب ملکوں سے آنے والے گجرات کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوئے اسی طرح گجرات سے بھی جا کر لوگ حجاز و یمن میں آباد ہوئے، آخری دور میں شیخ علی متقی اور ظفر الوالہ بمظفر و آلہ کے مصنف عبد اللہ محمد بن عمر آصفی بھی وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

سلاطین گجرات کے دور میں گجرات کی ترقی

سلاطین گجرات میں بڑے اولوالعزم فرمانروا گزرے جنھوں نے گجرات کے چپہ چپہ پر اپنی عظیم الشان یادگاریں چھوڑیں اور جن کے دور حکومت میں یہ علاقہ خوب پھولا پھلا، علم و فن، صنعت و حرفت، زراعت و باغبانی کو فروغ ہوا۔ مدارس، کتب خانوں اور خانقاہوں سے کوئی مرکزی جگہ خالی نہیں رہی، غرض علم و ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد ہوا اور ثقافت و تمدن، صنعت و تجارت کو اس عہد زریں میں یہاں جو ترقی ہوئی وہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کو نصیب نہ ہو سکی۔

گجرات کا قدرتی محل وقوع بھی بڑا دلفریب اور دلآویز ہے، اس کے اور ملک عرب کے درمیان بحر عرب حائل ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے لفظوں میں "عرب اور گجرات کے درمیان صرف پانی حائل تھا اور نہ جو موج اس ساحل سے اٹھتی تھی وہ اس ساحل سے آکر ٹکراتی تھی اور جو طوفان ادھر سے اٹھتا تھا وہ دم کے دم میں ادھر پہنچ جاتا"، اسی سمندری راستہ سے عربوں کی آمد و رفت سنہ عیسوی کے آغاز

سے پہلے سے جاری ہے۔

گجرات صرف بیوپاریوں اور تاجروں کی گزرگاہ اور تجارتی اشیاء ومصنوعات کی درآمد وبرآمد کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ مصر وشام اور حجاز ویمن سے آنے والے علماء محدثین، فقہا اور بزرگان دین کا اولین مرکز بھی تھا، ان کے فضل وکمال کی مسند سب سے پہلے یہیں بچھتی تھی۔ اس کا شہر سورت بمبئی کے عروج سے پہلے مغلوں کے زمانے میں باب کعبہ کہلاتا تھا، جو ہندوستان ہی نہیں وسط ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک سے آنے والے مشتاقان حرم کی اولین منزل تھا، گجرات کے دریائے نربدا اور تاپی بحر عرب کے دہانے ہیں، انہی سے ہوکر بیت اللہ کے زائرین ساحل عرب پر اترتے تھے۔

گجرات کی موجودہ دینی حالت زمانہ ایک حال پر نہیں رہتا، عدم تغیر اور ثبات محال ہے، اس لیے گو اب گجرات کی گزشتہ علمی تہذیبی وثقافتی عظمت باقی نہیں رہی، تاہم اب بھی تجارت کی چہل پہل اور بازاروں کی رونق قائم ہے اور دوسرے علاقوں کے مقابلے میں یہاں کے افراد دینی وتبلیغی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔

سارے ہندوستان کے دینی مدارس بمبئی اور گجرات کے ارباب خیر کی فیاضیوں سے متمتع ہو رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند کا ایک دھارا ڈابھیل کو سیراب کر رہا ہے، جس نے احادیث اور دوسرے علوم کی نایاب کتابیں شایع کی ہیں، راندیر، سملک اور ترکیسر میں قال اللہ وقال الرسول کی مجلسیں جمی ہوئی ہیں، مسجدوں کی رونق قائم ہے، یہاں کے مسلمان تبلیغی وفود اور گشت میں ہراول دستہ ہوتے ہیں، خانقاہوں میں رشد وہدایت کے چراغ جل رہے ہیں، صوفیہ ومشائخ کے اذکار واوراد سے گنبد مینا پر شور ہے۔

احمد آباد اور یہ زین البلاد احمد آباد جو ہندوستان کے خوبصورت اور موجودہ صوبہ گجرات کا اہم شہر ہے پہلے اسلامی عہد میں گجرات کی سلطنت کا پایۂ تخت تھا، اس کو سلطان احمد گجراتی نے ایک قصبہ اساول میں شیخ احمد کھٹو کے استخارہ واستشارہ سے ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء میں دریائے سابرمتی کے کنارے ایک پُرفضا مقام پر آباد کرایا تھا۔ اس کی تعمیر میں احمد نام کے چار شخص شریک تھے اور یہ سب کے سب صاحب صلاح وتقویٰ تھے، ایک خود سلطان احمد، دوسرے شیخ احمد کھٹو، تیسرے شیخ احمد اور چوتھے ملا احمد۔ اس کی داغ بیل ڈالنے کا وقت آیا اور زمین کی پیمائش کی گئی تو رسی کا ایک سرا سلطان احمد کے ہاتھ میں اور دوسرا شیخ احمد کھٹو کے ہاتھ میں تھا۔ ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں احمد آباد کی فصیل تیار ہوئی، جس میں بارہ (۱۲) دروازے تھے، محمود بیگڑہ کے دور میں احمد آباد کی ترقی اور آبادی بہت بڑھ گئی تھی، ۳۶۰ محلے تھے اور اپنے مضافات وتوابع کے ساتھ ۲۷ میل میں پھیلا ہوا تھا، قلعہ بھدر کی لمبائی ۴۸۰ اور چوڑائی ۴۰۰ ہاتھ تھی۔ بازار وسیع تھے، سڑکیں اتنی کشادہ تھیں کہ دس گاڑیاں پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں، سڑکوں پر چورس پتھر بچھے تھے، اس کی وجہ سے نہ گرد اڑتی تھی اور نہ کیچڑ ہوتا تھا اور نہ موسم گرما میں سڑکیں تپتی تھیں، سلاطین کو باغ لگوانے اور شجرکاری کا غیر معمولی شوق تھا، ان کے ذوقِ چمن آرائی نے احمد آباد کو گل وگلزار بنا دیا تھا، وزیر عماد الدین محمود گیلانی کے گھنے باغ میں پھل دار اور خوشبودار درختوں کے ساتھ زعفران کی کاشت ہوتی تھی، باغوں میں دلکش اور فرحت بخش عمارتیں، آبشار اور نہریں ہوتی تھیں، سلطان قطب الدین نے باغ نگینہ تیار کرایا تھا، یہ کانکریہ تالاب کے بیچ میں انگوٹھی کے نگینہ کی طرح جڑا ہوا تھا، باغ کے وسط میں ہونے کی وجہ سے ایک فرحت زا مقام بن گیا تھا،

جس کے پل میں ۴۸ طاق تھے، قطب الدین نے اس کا نام حوض قطبی رکھا تھا، اس کے علاوہ بھی متعدد تالاب یہاں تھے۔

سڑک، تالاب اور باغ کے علاوہ دوسرے رفاہی کام بھی سلاطین نے انجام دیئے، شفاخانے، سرائیں، مسافر خانے اور لنگر خانے تعمیر کرائے، احمد آباد میں سیف خاں کا شفاخانہ بہت مشہور تھا جو جہانگیر کے دور میں تعمیر ہوا تھا، تیموری دور کے ایک اور شفاخانہ میں شاہجہاں نے حکیم محمد ہاشم کو طبیب مقرر کیا تھا۔

احمد آباد صنعت و حرفت کا بھی مرکز تھا، روئی، افیون، چاندی، سونے اور ریشم کے کام کے لیے مشہور تھا، یہاں کے کپڑے بیش قیمت اور بے مثال ہوتے تھے، ان کی نساجی، گازری، قصاری، کندی گری اور دقاقی وغیرہ کے کام میں بڑی چمک دمک، صفائی اور نفاست ہوتی تھی، احمد آباد کے رنگین اور چھپے ہوئے کپڑے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں قاہرہ اور بیکن بھیجے جاتے تھے، کمخواب اور مشروع یہاں کی خاص چیز تھی مور کلا مشجر بہت نفیس بنتا تھا، ایک خاص قسم کا کپڑا "چند رکلا" بھی تیار ہوتا تھا، اس کے دونوں کور ریشم کے باقی تانا بانا سوت کا ہوتا تھا، چاند کا نقشہ بھی رہتا تھا۔

جہانگیر کے زمانے میں شاہجہاں گجرات کا ناظم ہوا تو ایک سرکاری کارخانہ قائم کیا، قلعہ معلی اور تخت طاؤس کے تیار ہونے پر ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں جو دربار ہوا تھا اس کے لیے زربفت کا نہایت قیمتی شامیانہ اسی کارخانہ میں تیار ہوا تھا، جس کا مخملی سائبان، طلائی اور نقرئی ستونوں کے نقش و نگار احمد آباد کے کاریگروں کی ہنرمندی کا نمونہ تھے۔

احمد آباد میں کاغذ کا کارخانہ بھی تھا، یہاں کے کاغذ سفیدی اور چکنائی میں بے مثال ہوتے تھے اس لیے ان کی بڑی مانگ تھی، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے گزر کر عرب و شام اور روم بھی جاتا تھا۔ یہاں زرافشاں کاغذ بھی تیار ہوتا تھا، جس کے بعض نمونے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

ملا داؤد راج کا صابون کا کارخانہ تھا، نیل سازی کے کارخانے بہت تھے، ان سے نیل یورپ کے ملکوں میں جاتی تھی، جنوبی احمد آباد میں ایک پن چکی تھی جس سے آٹا پیسنے کا کام لیا جاتا تھا، اسی زمانے میں احمد آباد میں آب رسانی کا باقاعدہ نظام قائم ہو گیا تھا۔

احمد آباد اور گجرات کی ثقافتی اور تمدنی ترقی کا ایک ثبوت یہاں کے مدارس اور کتب خانے بھی ہیں، خاص احمد آباد کے چند کتبخانے یہ تھے۔

احمد شاہ کا کتب خانہ شاہی، کتب خانۂ عثمان پورہ، شیخ احمد کھٹو کا کتب خانۂ سرکھیج، حضرت شاہ عالم کا کتب خانہ، علامہ شاہ وجیہ الدین علوی کا کتب خانہ، شیخ عبد القادر حضرمی صاحب النور السافر کا کتب خانہ، کتب خانہ مدرسہ ہدایت بخش، کتب خانہ مدرسہ ولی اللہ، کتب خانہ سیفیہ، کتب خانہ سلیمانی، محکمہ قضا کا کتب خانہ، مولانا اسحاق کا کتب خانہ، بھولاناتھ کا کتب خانہ، کتب خانہ غوثیہ اور اب درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کا کتب خانہ۔

احمد آباد کے بعض مدرسوں کے نام ملاحظہ ہوں:

مدرسہ سرکھیج، مدرسہ شیخ برہانی، مدرسہ شاہ عالم، مدرسہ عالیہ علویہ، مدرسہ ہدایت بخش، مدرسہ کردیہ، مدرسہ اعظم، مدرسہ سیف خاں، مدرسہ ولی اللہ۔

بعض مدرسوں کے ساتھ بورڈنگ بھی تھے، بعض مدرسے اور کتب خانہ شیعہ

بوہروں کے تھے، صنعت، موسیقی اور انجینیرنگ کے مدرسے بھی تھے۔

سلاطین گجرات نے اپنی دینداری کی وجہ سے مسجدوں کی تعمیر پر بھی بڑی توجہ دی، کہا جاتا ہے کہ احمد آباد میں ایک ہزار مسجدیں تھیں، ان کے لیے دور دور سے پتھر منگائے گئے تھے، جن میں سے بعض مسجدیں بادشاہوں، امرا و اعیان دولت اور ان کی بیگمات سے منسوب ہوئیں، ان کے باہر ان کے بانیوں کی قبریں ہیں، معماروں نے مسجدوں کی تعمیر میں اپنا خاص فن اور مہارت دکھائی تھی، ان کے منارے دو ہوتے تھے، بعض مسجدوں کے ایک منارہ کو حرکت دینے پر دوسرا منارہ جو فاصلہ پر ہوتا تھا حرکت کرتا تھا۔

جامع احمد شاہ سب سے بڑی مسجد تھی جو مغربی ہندوستان میں اپنی قسم کی بہترین عمارت مانی جاتی تھی، جہانگیر بادشاہ نے تزک میں اس کی تعریف کی ہے، اسکے ستون ۳۵۲ تھے، صحن کو چھوڑ کر اس کا طول سو۱۰۰ اور عرض پچاس۵۰ ہاتھ تھا، بلند مناروں کا طول ۱۸۶ ہاتھ تھا، مسجد کے تین۳ دروازے تھے، احمد آباد سے ۵ میل کے فاصلے پر ایک مسجد خانہ کعبہ کے نقشہ پر بنائی گئی تھی، اچھوت کاکی کی مسجد، جالی کی مسجد (کھجوریا) اور رانی سپاری کی مسجد صناعی کا بہترین نمونہ ہیں۔

احمد آباد میں ہندوؤں کے بھی مختلف طبقوں اور ذاتوں کے لوگ آباد تھے، ان کے مندر، تیرتھ، کنڈ، تالاب اور دوسری مقدس عمارتیں بھی تھیں، عہد سلاطین میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے، لیکن انگریزوں نے نفاق و افتراق کی جو تخم ریزی کی تھی اس کے برگ و بار اب بھی ہرے بھرے ہیں اور قومی حکومت کے قائم ہونے کے بعد بھی تفریق و غلامی کی لعنتیں برقرار ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ احمد آباد اور گجرات میں فرقہ وارانہ منافرت اور تعصب کی آگ اکثر بھڑک اٹھتی ہے۔

اس طویل تمہید میں یقیناً آپ کے لیے کوئی جدید اور لذیذ بات نہیں ہوگی مگر میں اپنے جذبۂ شوق کو کیا کہوں جو بے اختیار ماضی کے ورق الٹنے اور قصۂ کہن سنانے لگا، درد دل کہنے کے لیے نہ یہ مجلسیں ہمیشہ میسر آتی ہیں اور نہ التفات دل دوستاں روز روز نصیب ہوتا ہے، گجرات اور احمد آباد کے عروج کی داستان سرائی کا مقصد یہ بھی تھا کہ ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

جب گجرات کی علمی، تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی ترقی کا یہ حال رہا ہے تو اس کی مذہبی و روحانی بہار کا کیا عالم رہا ہوگا ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

گجرات میں تصوف و سلوک

جس طرح گجرات میں تجارت کی گرم بازاری کے ساتھ شروع ہی سے دینی علوم کے زمزمے خصوصاً حدیث نبوی کے ترانے گونج رہے ہیں، اسی طرح صوفیہ و مشائخ اور صالحین و ابرار کی معرفت کی دکانیں بھی رونق پر تھیں، جہاں طالبین و سالکین کو دوائے دل مہیا کی جاتی تھی اور کفر و جہالت کا زنگ دور کر کے ایمان و یقین سے قلوب منور کیے جاتے تھے کیونکہ یہی وہ مقدس گروہ ہے جس نے اسلام کی اشاعت و ترویج کا برتر فریضہ صرف تلقین و دعوت ہی سے نہیں اپنے عمل و اخلاص سے انجام دیا ہے۔

باں گروہ کہ از ساغر وفا مستند — سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:

"ہندوستان کے اسلامی دور میں دو قسم کی بادشاہت ساتھ ساتھ قائم تھی، ایک تو تخت و تاج کے حکمرانوں کی اور دوسری خانقاہ کے بوریا نشینوں کی، ایک توپ و تفنگ سے مملکت کو اپنے زیر نگیں کرتے تھے تو دوسرے اپنے بلند اخلاق

اور اعلیٰ اوصاف کے ذریعہ سے ذہن و قلب کو تسخیر کرتے تھے اور آج یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کے اثرات زیادہ غالب رہے، مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج بھی ان صوفیائے کرام کی تصانیف ذہن کی پراگندگی کو سکون، قلب کے انتشار کو اطمینان اور گمراہوں کی کج روی کو ہدایت بخشنے میں کامیاب اور موثر ہیں، چنانچہ انکی تصانیف کو بجا طور پر اسلامی دور کا ایک بیش قیمت خزانہ کہا جا سکتا ہے اور اس دور کے مذہب، اخلاق اور معاشرت میں ان صوفیائے کرام نے جو انقلابات پیدا کیے ان کو صحیح طور سے سمجھے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔" (مقالات سلیمان ج ۱ ص ۳۹۹)

گجرات جس طرح گہوارۂ علم و فن رہا ہے، اسی طرح سرچشمہ روحانیت و ہدایت بھی رہا ہے، اکثر سلاطین گجرات دیندار تھے، اس لیے انہوں نے دور دور سے علما و مشائخ کو یہاں آباد کرایا اور ان کی قدردانی کی، ان کے لیے جاگیریں مقرر کیں اور انہیں مواضعات دیے، مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، احمد آباد اور گجرات کے دوسرے شہروں میں انکے مزار و مقابر آج تک زیارت گاہ خلائق ہیں۔

تصوف کے اکثر سلاسل کو گجرات میں رواج و قبول نصیب ہوا، چشتیہ، سہروردیہ، مغربیہ، عیدروسیہ، قادریہ، رفاعیہ، نقشبندیہ اور شطاریہ وغیرہ کا فیض عرصہ سے جاری ہے۔ ان سلسلوں کے مشہور اور باکمال مشائخ نے اپنی تعلیمات کا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، بعض صوفیہ اور فقرا کی ظاہری حالت ہندو جوگیوں اور بدھ بھکشوؤں سے ملتی جلتی تھی اس لیے عوام کو ان سے زیادہ گرویدگی اور عقیدت رہی، انہوں نے صرف مسلمانوں کی اصلاح و تربیت ہی نہیں کی بلکہ اپنے ملک و وطن کی خدمت کی اور یہاں کے تمام باشندوں کو میل، محبت، دوستی اور حسن خلق کا درس دیا، ان کی سیرت و کردار کو

بنایا اور سنوارا، ان کے ذہن و قلب کی صفائی کی اور اپنی مفید اور پاکیزہ باتوں سے سب کے دل موہ لیے۔

گجرات کے صوفیہ نے اپنے ملک کے علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایے میں اضافہ کر کے اس کی عظمت میں چار چاند لگایا اور اس کا نام پوری دنیا میں روشن کیا۔ گجرات کے بعض کبار صوفیہ نے اس ملک کے علم و ادب، لٹریچر اور زبان اور تہذیب و ثقافت کو بہت کچھ دیا ہے۔ یہاں ہم ایک ممتاز بزرگ کا ذکر کرتے ہیں، جن کی درگاہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حضرت پیر محمد شاہ

حضرت سید محمد بن شاہ امین الدین بن شاہ علاء الدین کا لقب حبیب اللہ اور تخلص اقدس تھا، پیر محمد کے نام سے مشہور ہوئے، ان کی ولادت بیجاپور (دکن) میں ۱۵ شعبان ۱۱۰۰ھ میں ہوئی، ولادت سے قبل ہی والد بزرگوار کا انتقال ہو چکا تھا، والدہ محترمہ شاہ بی بی بھی ان کے بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھیں، اس لیے ان کے عم بزرگوار سید عبدالرحمٰن صاحب نے پرورش و پرداخت کی۔

حضرت پیر محمد شاہ پدری سلسلہ سے حضرت سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں تھے اور والدہ محترمہ کا خاندانی تعلق حضرت سید محمد گیسو دراز سے تھا، حضرت پیر محمد والد کی طرف سے حسنی اور والدہ کی طرف سے حسینی تھے۔

حضرت پیر محمد نے اپنی ذہانت کی وجہ سے سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، ان کے چچا نے بچپن میں علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی تعلیم بھی دی، اور نو برس کی عمر میں سلسلۂ قادریہ میں بیعت کیا، پھر چچا صاحب کے ایما سے حجاز جا کر

وہاں کے ممتاز علماء و فضلاء سے کسب فیض کیا۔ چھ برس مکہ معظمہ میں اور سات برس مدینہ منورہ میں قیام کرنے کے بعد ۲۳ برس کی عمر میں ہندوستان واپس تشریف لائے اور احمد آباد کے باہر محلہ راج پور میں بی بی کی مسجد میں قیام پذیر ہوئے جو اس وقت بہت وسیع اور آباد تھا، ہر قسم کے پیشہ ور اور تاجر یہاں رہتے تھے، جن کی بلند و بالا اور خوبصورت عمارتیں تھیں۔ کچھ عرصہ تک یہاں کے صناع اور کاریگروں کی اصلاح و ہدایت فرمانے کے بعد جب ان کی شہرت بڑھی تو کالوپور تشریف لائے یہاں کے ایک دوکاندار محمد فاضل کو ان سے بڑی انسیت ہوگئی تھی، حضرت پیر محمد نے انکا نام تبدیل کرکے محمد ظہور رکھا، ان کی کرامتیں دیکھ کر یہاں کے اور لوگوں کا میلان بھی ان کی جانب زیادہ ہوگیا تھا۔

اس زمانے میں تصوف کی اکثر کتابیں زیر مطالعہ رہیں اور درگاہ حضرت شاہ وجیہہ الدین میں چلہ کشی بھی کی۔ اس کے بعد جامع مسجد احمد آباد میں معتکف ہوگئے اور ہر جگہ کی آمد و رفت ترک کرکے صرف اصلاح و ہدایت خلق کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن درگاہ شاہ وجیہ الدین میں روزآنہ فاتحہ خوانی کے لیے جانا اب بھی موقوف نہیں کیا، وہاں سے واپسی میں موجودہ روضہ حضرت پیر محمد شاہ کے قریب ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی اس میں چند منٹ رکتے اور جب قیام کے لیے کہا جاتا تو فرماتے انشاءاللہ آؤں گا تو اسی جگہ ہمیشہ قیام کرونگا۔

نفس کشی کے لیے وہ عرصہ تک مسجد میں آنے والوں کے پیر دھلایا کرتے تھے۔ قادریہ کے علاوہ شطاریہ، چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، خلوتیہ، ہمدانیہ، نقشبندیہ، مداریہ اور اویسیہ سلسلوں میں بھی ان کو بیعت حاصل تھی، چالیس برس کی عمر میں ان پر

عالم سُکر طاری ہوا اور پانچ برس کے بعد عالم صحو میں آئے۔ آخر زندگی میں ان پر وجد و شوق کا غلبہ رہتا اور کبھی ایسی کیفیت ہوتی کہ کئی روز تک بے قرار رہتے اور بدن تپ زدہ کی طرح گرم ہو جاتا، اسی حال میں ۲۶ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ کو دوشنبہ کے دن واصل بحق ہوگئے، موجودہ مقبرہ کے پاس نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد تدفین کے لیے لوگ موسیٰ سہاگ کے قبرستان میں لے جانا چاہتے تھے مگر باوجود کوشش کے جنازہ اٹھ نہیں سکا تو لوگوں کو ان کی وہ بات یاد آئی کہ "آؤں گا تو میں ہمیشہ رہوں گا" عمر بھر شادی نہیں کی اور مجرد رہے۔

حضرت پیر محمد کے بہت سے خوارق بیان کیے جاتے ہیں، ان کی یادگار چند فارسی و اردو منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں :

۱۔ مجموعہ رسائل (فارسی) یہ ۳۵ رسائل پر مشتمل ہے جن میں شجروں یعنی سلسلۂ بیعت اور خلعتوں کا ذکر ہے۔

۲۔ نورالشیوخ (فارسی) اس میں ان تمام سلسلوں کا ذکر ہے جن میں وہ بیعت تھے اور بعض پیرانِ طریقت کا مختصر حال بھی درج ہے۔

۳۔ مکاشفات (فارسی) یہ بہت سی نظموں کا مجموعہ ہے جن میں بعض مکاشفات اور بعض شطحیات کے ذیل میں آتی ہیں۔

۴۔ معمہ و غزلیات (فارسی) اس کی غزلیں مثنوی کے طرز پر ہیں اور توحید و نصائح کے مضامین پر مشتمل ہیں، آخر میں چند رباعیاں بھی ہیں۔

۵۔ عشق اللہ (اردو) حضرت پیر محمد کی سب سے اہم تصنیف ہے، جو تصوف کا نچوڑ ہے، اس میں سالک کو دس سبق دیے ہیں اور لطائف قلبی و حقیقی وغیرہ کا بیان ہے۔

۶۔ مراثی (اردو) یہ اٹھارہ مراثی کا مجموعہ ہے جن کا مشترک موضوع غم امام حسینؑ ہے۔

فارسی واردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

۱۔ خدا ہست نور زمین و زماں   نور اللہ نور السموات خواں

۲۔ باقدس کرم کن الٰہی چناں   کہ جز تو نہ بیند درین و دراں

۳۔ نہال عشق را مردن بہار است   دگر موتش فراق و غیب یار است

۴۔ من شراب و نیز ساقی نیز رند بادہ نوش   اے تواقدس عین مطلق ستر وحدت را بنوش

۱۔ کچھ سکھ نہیں دنیا منیں دنیا سے اب جانا بھلا   دوروز کی دنیا منیں جینے سے ہے مرنا بھلا

۲۔ دنیا سرا سر نیند ہے آرام جوں سپنا منی   سپنے کے فانی عیش پر ہنسی سین ہے رونا بھلا

۳۔ دیکھ سکھی جگ ہے پیا جگ میں پیا دستا ہے خوب   ایک تخم جوں گلزار میں ہر پھول میں ہنستا ہے خوب

۴۔ تو ہے صبح میرا تیرا شمع میں   ترے بن میں جلتا ہوں اے نازنین

۵۔ نہ کر ظلم مجھ پر جدائی کا اب   تیرے بن میرا جیو رہے گا سو کب

کتب خانہ پیر محمد شاہ ابھی تک اچھے حال میں ہے جو سینکڑوں مخطوطات پر مشتمل ہے۔ مگر یہ بات افسوسناک ہے کہ جو بزرگان دین توحید کی دعوت اور شرک و بدعت کی مذمت کرتے رہے ہیں اب گجرات اور احمد آباد میں ان بزرگوں کے عقیدتمند ان کے مزاروں پر مشرکانہ اعمال واشغال میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، مولانا حالی مرحوم نے کہا ہے:

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں   اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

مزاروں پہ جا جاکے نذریں چڑھائیں   شہیدوں سے جا جاکے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

علامہ قاضی محمد اعلی بن علی تھانوی اور ان کی کتاب کشاف اصطلاحات الفنون

از ڈاکٹر عطش درانی۔ اسلام آباد

(۲)

اسلامی علمی تحقیق وتدقیق کی حیثیت سے کشاف اصطلاحات الفنون بہت بلند رتبہ رکھتی ہے جو بقول نورالحسن راشد صاحب "مختلف علوم کی اصطلاحات کی رہنما اور کلید" ہے۔ اصطلاحات فنون کے موضوع پر جو کتابیں قاضی صاحب کو میسر آئیں وہ کسی ایک موضوع کی گرہ کشائی کر سکتی تھیں مگر مختلف مضامین کی اصطلاحات سے ان کو کچھ سروکار نہیں تھا۔ اس لیے قاضی صاحب نے ایک ایسی کتاب کی ترتیب کا ارادہ کیا جو ایسی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ یہ کتاب ایک اندازے کے مطابق بیس برس میں مکمل ہوئی۔

کشاف اصطلاحات الفنون اسلامی دنیا میں اصطلاحات نگاری کا سب سے بڑا مظہر ہے، اس میں تمام مروجہ عقلی ونقلی علوم کی اصطلاحات بیان ہوئی ہیں جو موضوع کی جامعیت کے لحاظ سے اور فنی ترتیب کے لحاظ سے اسلامی ذخیرہ کی بے مثل کتاب ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بارھویں صدی ہجری کا بلکہ چودہ صدیوں کا سب سے بڑا

علمی کارنامہ ہے ۔ اس عظیم اور ضخیم لغت میں مصطلحات علوم عربی زبان (صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع) اصطلاحات علوم شرعی وکلام، اصول فقہ، اصطلاحات علوم سائنسی وتکنیکی، منطق، حکمت، علوم عدد، ہندسہ وطب، شامل ہیں اور یہ ہمیں بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی تک اسلامی علوم کے ارتقا اور عروج کا پتا دیتی ہیں۔ اس میں زیادہ اصطلاحات مفرد ہیں، مثلاً اخلاص، خفش، خصوص" وغیرہ۔ اگر کہا جائے کہ عربی کی مفرد اصطلاحات کی کمی کا گلہ کرنے والوں کے لیے یہ لغت ایک لاجواب تحفہ ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

اگر اس میں موجود صرف سائنسی وتکنیکی علوم کے احاطہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ علم ریاضی، علم حساب، علم عدد، جیومیٹری، فلکیات، ارغنون، موسیقی، الجبرا، مساحت، علم جرالاثقال، علم مرکز الاثقال، زیجات، تقویم، آلات، علم طبیعیات، علم الاجسام، علم مناظر، علم حرکت وسکون، علوم کون، علم مرکبات، معدنیات، نباتیات، حیوانیات، نفسیات، طب، فراست، طلسمات، فلاحت، بیطاری، ارضیات، جواہریات، کیمیا، سیمیا، تعبیرالرویا، احکام نجوم، علم السحر کی طرح کے سینکڑوں علوم کی اصطلاحات اس میں شامل کی گئی ہیں، اس کی وجہ مقدمہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ ایک قاضی کو مختلف النوع مقدمات میں ان تمام علوم کی اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے۔

کشاف میں ہر علم کی اصطلاحات اور ان کی تعریفات وتشریحات کو اس کے ماخذ ہی کے الفاظ میں فارسی یا عربی میں درج کیا گیا ہے۔ اگر فارسی ماخذ ہے تو متن بھی فارسی میں دیا گیا ہے اور اگر عربی ماخذ ہے تو متن بھی عربی میں ہے۔ ہر فن کو ابواب اور

فصول میں تقسیم کیا گیا ہے[18]۔ ہر اصطلاح کے بیان میں اس کے تلفظ، تعریف، اختلاف تعریف اور حوالہ کا اہتمام کیا گیا ہے[19]۔ بعض اصطلاحات تشریح بذات خود ایک مقالے کی صورت اختیار کر گئی ہیں ۔ مثلاً اگر ہم ص: ۳۳۰ سے ۳۴۴ تک لفظ "حقیقت" یا ص: ۳۳۷ سے ۳۴۶ تک "حرکت" پر درج مقالات ہی کا جائزہ لیں تو اس دائرۃ المعارف قسم کے کام کی وسعت اور عمق پر حیرت ہوتی ہے[20]۔ اسی طرح رسالہ تکسیر (۱۱۸۰ھ) دراصل کشاف ہی کا حصہ ہے جو طوالت کے باعث ایک رسالہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اصطلاحات نگاری میں علامہ تھانوی کے فضل وکمال کا اندازہ کرنے کے لیے گذشتہ بارہ صدیوں میں لغات واصطلاحات سازی میں ہونے والے کاموں کا اجمالی جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

اس وقت تک کے لغات نویسوں کو واضح طور پہ دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور پانچویں صدی ہجری تک کا ہے، جس میں ابوعمرو بن علا (۶۸ھ تا ۱۵۴ھ) سے لے کر ثعالبی نیشاپوری (۳۵۰ھ تا ۴۲۰ھ) تک کے ماہرین لغات شامل ہیں۔ یہ اہل علم صرف ونحو اور لغات کے ماہر تھے مگر جدید تکنیکی اصطلاحی حوالے سے انکا کوئی کام سامنے نہیں آیا، سوائے ابن سکیت اور ثعالبی کے کہ ان کے یہاں گھوڑوں، جانداروں اور گھاسوں کے اصطلاحی نام ملتے ہیں[21]۔ بعد کے مصنفین کے یہاں دائرۃ المعارف / قاموسی قسم کے کام ملتے ہیں، جیسے رسائل اخوان الصفا یا فارابی (م ۳۳۹ھ) کی احصاء العلوم وغیرہ مگر لغات نگاری کا تکنیکی کام عنقا ہے[22]۔ لے دے کے علی مجوسی کی دائرۃ المعارف میں الفبائی ترتیب نظر آتی ہے۔ خوارزمی کی مفاتیح العلوم میں

"کتاب سود مند" کا حصہ، ابن مسکویہ کی اقسام الحکمت اور نشوان حمیری کے شمس العلوم کی الفبائی اصطلاحات کی صورت یا حاجی خلیفہ کی کشف الظنون میں لائبریری سائنس کی چند اصطلاحیں کتب و فنون کتب کے ناموں کے حوالے سے ہیں۔ البتہ آقا رضی قزوینی کی لسان الخواص میں تعریفاتِ اصطلاحات قابل ذکر ہیں لیکن بارہویں صدی ہجری تک جدید اصطلاحات نگاری (Terminography) بلکہ اصطلاحی لغات نگاری (Lexicography) کے معیار پر کشاف اصطلاحات الفنون کے علاوہ کوئی اور کتاب پوری نہیں اترتی۔

سید حسین نصر نے اپنی کتابیات میں ایسے کئی لغات کا ذکر کیا ہے، جن سے عربی میں اصطلاحات سازی ہوتی رہی ہے، لیکن باقاعدہ اصطلاحات نگاری خال خال ملتی ہے۔[۲۳] جیسے چوتھی صدی ہجری میں الحسن بن نوح القمری (م ۳۹۰ھ) کی کتاب التنویر عباسی دور کی اہم کتاب ہے، جس میں معاصر اطبا کی کتب سے عربی اور معرب اصطلاحات حیاتیاتی اور ادویات کے نام مع تصورات و مفاہیم جمع کیے گئے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں یہ دمشق سے شایع ہو چکی ہے۔ اسی طرح نویں صدی ہجری میں ابوالحسن علی بن محمد الجرجانی کی کتاب التعریفات ہے، جس میں ان علوم کے علاوہ طبیعیات، ریاضی اور شرعی علوم کی اصطلاحات بھی شامل ہیں۔ یوں تو امام غزالی کی الاحیاء، الکندی کی فی حدود الاشیاء اور عبدالرزاق الکاشی (۷۸۸ھ) کی معجم فی مصطلحات الصوفیہ بھی اس دور کی کتابوں میں قابل ذکر ہیں۔ مگر اسلامی اصطلاحات نگاری کے زیادہ بڑے کام برصغیر میں ہوئے، جن میں تین نام اہم ہیں:۔ کشاف اصطلاحات الفنون (تھانوی ۱۱۵۸ھ) جامع العلوم یا دستور العلما (قاضی عبدالنبی احمد نگری ۱۱۷۳ھ)

ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں (۱۲۹۶ھ)۔ ان میں اولیت علامہ تھانوی کی کشاف کو حاصل ہے، جو باقی دونوں کا بنیادی ماخذ بھی ہے اور آج بھی دینی علوم میں اصطلاحات سازی کا جائزہ لینے کیلئے اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

جدید دور کی لغات نگاری میں بھی اور خاص طور پر عربی، فارسی کے علاوہ اردو اور دیگر زبانوں میں اصطلاحی کام انجام دینے کے لیے بھی کشاف اصطلاحات الفنون ایک بہت بڑے ماخذ کا کام دے سکتی ہے۔ اس کے فلسفیانہ اور منطقی طرزِ استدلال اور ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے جدید لغات کے انداز کے معانی کی تفہیم و تشریح کے سلسلے میں آج بھی بہت سے نادر ماخذوں تک رسائی اس کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اگر اس عظیم لغت کا اردو ترجمہ میسر آجائے تو نہ صرف اردو کے اسلامی ادب میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہوگا بلکہ لغات اصطلاحات میں بھی ایک ایسا تغیر آئے گا جس کے امکان کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر حدود کا اندازہ محال ہے۔

اگرچہ اردو میں اصطلاحات سازی کو اب محض الفاظ سازی سے الگ بڑھ کر جدید اصطلاحیات کے حوالے سے انجام دیا جانا چاہیے مگر اس عمل میں بھی چونکہ بنیادی حوالہ الفاظ یا ان کے سابقین کا بنتا ہے، اس لیے اردو میں اصطلاحی عمل کو انجام دینے کے لیے مفرد الفاظ کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے بھی یہ لغت کارآمد ہو سکتی ہے، مزید برآں عربی سے استفادہ کرنے والے گروہ کے دلائل بھی قوی ہیں۔ وحیدالدین سلیم کے نزدیک[۲۴]:

"اول: عربی زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور اسی سبب سے وہ تمام مسلمان قومیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اس زبان سے یکساں طور پر مانوس ہیں"

اگر اس زبان کے الفاظ سے اسی زبان کے قواعد کے مطابق علمی اصطلاحیں بنائی گئیں تو دنیا کے تمام مسلمان ان کو آسانی اور دلچسپی کے ساتھ قبول کر لیں گے اور جس طرح یورپ کی علمی زبان تمام ممالک یورپ کے لیے ایک بین قومی زبان ہے، اسی طرح ہماری زبان بھی تمام بلاد اسلامیہ کے لیے ایک بین قومی زبان ہوگی۔

دوم: عربی زبان پہلے سے علمی زبان ہے۔ مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے جو انہوں نے زمانہ سابق میں سرانجام دیے تھے، اس زبان میں جمع ہیں۔ اگر جدید علمی اصطلاحیں بھی اسی زبان کے الفاظ سے اور اسی زبان کے قواعد کے مطابق وضع کر لی جائیں تو اس میں کافی قابلیت موجود ہے۔"

عربی سے استفادہ کے مخالفین کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس زبان میں مفرد مادوں کی کثرت کے باوجود لچک معدوم ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خاص طور پر سماجی علوم میں ہم اپنے عظیم ذخیرۂ اصطلاحات سے خود کو محروم اور دور کر کے نئے نئے الفاظ کے شوق میں ان کے حلقہ معانی کو توسیع کرنا کجا سابقہ الفاظ کے حلقہ معانی کو کم اور مبہم کرنے کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سینکڑوں الفاظ معدوم ہیں اور سینکڑوں بے کار پڑے ہیں۔ ان سے وہ خدمت نہیں لی جا رہی جو وہ دوسرے الفاظ کی نسبت بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ کشاف اصطلاحات الفنون ایسے مفید اور مستند الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ان الفاظ کو اردو کے اور قریب لے آئے گا۔[25] جس سے یقیناً اردو کی ثروت و وسعت میں اضافہ ہوگا۔

گو اس موضوع پر "علامہ تھانوی" سے پہلے کئی اہل علم نے بھی توجہ کی ہے مگر اس تحریر کا مقصد کشاف کے حوالے سے جدید اصطلاحیات کی روشنی میں تاریخ علوم و لغات

میں علامہ کا مقام تعین کرنا ہے۔ تاہم یہ کاوش اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گی، جب تک تمام معلومہ نسخوں سے مرتب کردہ مستند ترین نسخہ اپنے اردو اور انگریزی ترجموں کے ساتھ وجود میں نہیں آ جاتا۔[26] ادارہ تحقیقات اسلامی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، خدا بخش لائبریری، مقتدرہ قومی زبان اور انجمن ترقی اردو جیسے اداروں کو انفرادی یا مشترکہ طور پر اس اہم کام کی طرف توجہ دینا چاہیے۔

علامہ کی دیگر کتابوں میں احکام الاراضی بھی اہم ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے علامہ کے ان نظریات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ احکام آراضی کے علاوہ اس کتاب میں دارالاسلام اور دارالحرب کا ذکر خاص طور پر پاکستان کے لیے قابل توجہ ہے۔ بیت المال کے ذریعے آمدنی اور ریاستی اخراجات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض معاشیات کے مطالعے میں اس کتاب کو اہم حیثیت سے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ احکام الاراضی کا ایک اردو ترجمہ بھی ہوا تھا جسے نور الحسن راشد صاحب نے گمشدہ قرار دیا ہے۔ ایک نسخہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے زیر مطالعہ بھی تھا۔ تاہم یہ طے ہے کہ یہ ابھی تک شایع نہیں ہوا اور اسے بھی اردو ترجمے کے ساتھ شایع ہونا چاہیے۔ شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ میں بھی اس پر اعتماد کیا گیا ہے اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) مولانا انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے استاد ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب ("برہان" دہلی، جون ۱۹۸۴ء) نے بھی اسے اہم اور قابل توجہ قرار دیا ہے۔ اتنے اہم ماخذ کو اب تک شایع ہو جانا چاہیے تھا، ہمیں چاہیے کہ تاریخ اسلامی کے اس سب سے بڑے اصطلاح نگار کو پوری دنیا کے سامنے ہر ممکن

طریقے سے پیش کریں اور انکے کاموں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔

حواشی

۱۲ جرجی زیدان، محمد پردین گنا بادی، لطفی عبدالبدیع وغیرہ ۱۳ جن علوم و فنون کا احاطہ اس کشاف میں کیا گیا ہے، انکی تفصیل (کشاف اصطلاحات الفنون، المقدمہ، التقسیم ص ۱-۳۴) میں یوں دی ہے:

اول: علوم نظریہ غیر متعلقہ: منطق، حکمت، طب، خیاطہ وغیرہ۔

دوم: علوم آلیہ و غیر آلیہ:

سوم: عربی و غیر عربی:

چہارم: شرعی و غیر شرعی:

پنجم: حقیقی و غیر حقیقی:

ششم: عقلی و نقلی:

ہفتم: جزئی و غیر جزئی:

۱۴ ایک مثال ملاحظہ ہو:

فن اول: عربی اصطلاحات اور بعض غیر اصطلاحی الفاظ پر مشتمل ہے۔

باب الف: کئی فصول پر مشتمل ہے، جو ہر اصطلاح کے آخری حرف کے حوالے سے درج ہیں۔ مثلاً: ادب:

فصل الباء: موحدۃ الادب پر مشتمل ہے اور مختلف حوالوں سے تعریفات دی گئی ہیں۔

۱۵ اصطلاحات کے بیان میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اگر متن عربی میں ہے تو اسے عربی میں درج کیا گیا ہے اور اگر فارسی میں ہے تو اسے فارسی میں رہنے دیا گیا ہے۔

" فصل العین المہملۃ: الجدع بالفتح وسکون الدال المہملۃ نزد عروضیان انداختن سبب (ساکن کردن تا از مفعولات فاع باند بجای) ادفعں نہند چرا کہ فاع بی معنی است و مستعمل نیست و آن رکن کہ درو جدع واقع شدہ باشد آنرا مجدوع گویند کذا فی عروض سیفی (ص: ۲۳۱)

الجرعۃ بالضم وسکون راء مہملۃ یک آشام از آب و شراب مانند آن کما فی الصراح و در اصطلاح صوفیہ عبارتست از اسرار مقامات کہ در سلوک از سالک پوشیدہ ماندہ بود کذا فی بعض الرسائل۔ (ص: ۲۳۱)

فصل الصاد المہملۃ، الحرص بالکسر و سکون الراء المہملۃ عند السالکین ضد القناعۃ وھو طلب زوال نعم الغیر وقیل طلب مالا یقسم وقال اہل الریاضۃ الحرص فغیر مذموم عند العقلاء، کشا فی خلاصۃ السلوک۔ وفی اصطلاحات السید الجرجانی الحرص طلب شیئ باجتہاد فی اصابۃ۔ (ص: ۳۰۸)

الحصۃ بالکسر والتشدید ہی عبارۃ عن المفہوم الکلی باعتبار خصوصیۃ ما نہی فرد اعتباری بخلاف الفرد فان الخصوصیۃ فیہ بالذات۔ وقال المولوی عصام الدین فی حاشیۃ الفوائد الضیائیۃ فی بحث التمییز الحصۃ لا تطلق فی المتعارف الا علی الفرد الاعتباری الذی یحصلہ العقل من اخذ المفہوم الکلی مع الاضافۃ الیٰ معین ولا تطلق علی الفرد الحقیقی ویجیٔ فی لفظ المقید فی فصل الدال المہملۃ من باب القاف ویؤیدہ ما وقع فی حاشیۃ السید علی شرح المطالع فی مباحث الفصل من ان الحصۃ عبارۃ عن الطبیعۃ من حیث انہا مقیدۃ بقید ہو خارج عنہا وہکذا فی الشرح الفصوص للمولوی عبدالرحمٰن الجامی فی الفص الاول حیث قال الحصۃ عبارۃ عن تمام الحقیقۃ مکتنفۃ بالعوارض المشخصۃ انتہی۔ وبالجملۃ فالقید فی الحصۃ خارج عن الحقیقۃ وفی الفرد الحقیقی داخل فیہا۔ والحصۃ عند اہل الجفر اسم

تسطیر التکسیر و یسمیٰ ایضا بالبرج والزمام والاسم (ص : ۳۰۸)

الخطبۃ بالضم۔ ہی عبارۃ عن کلام مشتمل علی البسملۃ والحمدلۃ والثناء علی اللہ تعالیٰ بما ہو اہلہ والصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وتکون فی اول الکلام۔ ثم خطبۃ المنابر غیر خطبۃ الدفاتر لان خطبۃ المنابر تشتمل علی ما ذکرنا مع اشتمالہا علی الوصیۃ بالتقویٰ والوعظ والتذکیر ونحو ذلک، بخلاف خطبۃ الدفاتر فانہا بخلاف ذلک کذا فی العینی شرح صحیح البخاری فی شرح الحدیث الاول۔ اعلم ان خطبۃ الکتب ان الحقت بہا بعد تصنیفہا وتالیفہا بان الف المولف کتابہ اولا ثم الحقہ الخطبۃ تسمیٰ خطبۃ الحاقیۃ وان کتب اولا ثم الف الکتاب تسمیٰ خطبۃ ابتدائیۃ۔ (ص : ۴۰۵)

۲۰ "حقیقت" کے ضمن میں "بالفتح تطلق بالاشتراک فی عرف العلماء علی معان" سے شروع کر کے اس کے استعارہ، مجاز مہملہ سے اختلاف کا بیان، عربی فارسی کے ماہرین اصطلاحات شرع وعلم و بیان و لغت کے حوالے سے آغاز کیا گیا ہے۔ اہل اصول کے قول مثلاً قاضی ابی بکر معتزلہ کے عقائد و تفہیمات کے بیان سے بحث کرتے ہوئے اہل تصوف کے بیان مولوی عبدالرحمٰن جامی شرح الفصوص تک کے اختلافات کو سمیٹا گیا ہے۔ "حرکت" کے ضمن میں "بفتح الحاء والراء المہملہ فی العرف العام" سے شروع کر کے صاحب الاطول کے حوالے سے متکلمین اور اہل لغت کی تشریحات کمیت و کیفیت کے حوالے سے بیان ہوا ہے اس کے اطلاقات شرح الصحائف جیسے حوالوں سے بیان ہوئے ہیں۔ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلافات درج کرتے ہوئے مولوی عصام الدین اور مولوی عبدالحکیم کے حواشی شرح العقائد النسفیہ سے استفادہ کرتے ہوئے حرکت کی جملہ اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے اسکے ساتھ حرکات الافلاک، حرکت بسیطہ، حرکت مختلفہ، حرکت مفردہ، حرکت مرکبہ، حرکت

شرقیہ، حرکت اولیٰ، حرکت غربیہ، حرکت اعلیٰ و حرکت اسفل وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

۲۱ لغات نویسوں کے پہلے ادوار کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ابوعمرو بن علا (۶۸ھ تا ۱۵۴ھ)، لیث (۹۴ھ تا ۱۷۵ھ)، ابوعمرو شیبانی کوفی (۹۶ھ تا ۲۰۶ھ)، خلیل بن احمد فراہیدی (۱۰۰ھ تا ۱۷۴ھ)، ابوعبیدہ (۱۱۰ھ تا ۲۰۹ھ) کسائی (۱۱۲ھ تا ۱۸۹ھ)، ابوزید بصری (۱۱۹ھ تا ۲۱۵ھ)، سیبویہ فارسی (۱۲۱ھ تا ۱۶۱ھ) الاصمعی (۱۲۳ھ تا ۲۱۶ھ) خلف احمر (۱۲۵ھ تا ۱۸۷ھ)، ابن کلبی کوفی (۱۲۵ھ تا ۲۰۴ھ)، لحیانی (۱۳۶ھ تا ۲۱۵ھ)، ابوالہیثم رازی (۱۳۱ھ تا ۲۲۶ھ)، فراکوفی (۱۴۴ھ تا ۲۰۷ھ)، ابن اعرابی (۱۵۰ھ تا ۲۳۱ھ)، ابن شمیل بصری (۱۵۰ھ تا ۲۰۳ھ)، ابوعبید روی (۱۵۴ھ تا ۲۲۴ھ)، سلمہ (۱۶۲ھ تا ۲۴۰ھ)، ابن سکیت (۱۸۶ھ تا ۲۴۴ھ)، ابوتراب نخشبی خراسانی (۱۸۹ھ تا ۲۴۵ھ) ثعلب کوفی (۲۰۰ھ تا ۲۹۱ھ)، مبرد (۲۱۰ھ تا ۲۸۵ھ)، ابن قتیبہ دینوری (۲۱۳ھ تا ۲۷۰ھ)، ابن درید بصری (۲۲۳ھ تا ۳۲۱ھ)، زجاج (۲۳۰ھ تا ۳۱۱ھ) ازہری ہروی (۲۸۲ھ تا ۳۷۰ھ)، سیرانی (۲۸۴ھ تا ۳۶۸ھ) ابن خالویہ ہمدانی (۳۱۵ھ تا ۳۷۰ھ) ابن فارس رازی (۳۲۹ھ تا ۳۹۰ھ)، جوہری فارابی (۳۳۲ھ تا ۴۲۹ھ) اور ثعالبی نیشاپوری (۳۵۰ھ تا ۴۲۹ھ) قابل ذکر ہیں (مقدمہ کتاب، کشاف اصطلاحات الفنون نسخہ تہران از محمد پروین گنابادی، ص ص: ۱، ۲)۔

۲۲ علی بن عباس مجوسی (م ۳۸۴ھ): دائرۃ المعارف طبی (الفبائی ترتیب سے)

ابوعبداللہ محمد بن احمد خوارزمی (م ۳۸۰ھ) مفاتیح العلوم

ابوحیان توحیدی (م ۴۰۰ھ): مقابسات:

ابوعلی احمد بن محمد ابن مسکویہ م ۴۲۱ھ) اقسام الحکمت:

ابو علی حسین بن عبداللہ ابن سینا (م ۴۲۷ھ) رسالہ در ماہیت علوم۔

ابوبکر بن خیر بلوی (م ۵۵۹ھ) انموذج العلوم

نشوان بن سعید حمیری (م ۵۷۰ھ) شمس العلوم (۱۸ جلد) : الفبائی اصطلاحات علوم)

ابن جوزی (۵۹۷ھ) المدہش

فخر رازی (م ۶۰۶ھ) جامع العلوم اور حقائق الانوار

سکاکی (م ۶۲۶ھ) مفتاح العلوم

نصیرالدین طوسی (م ۶۷۲ھ) اقسام الحکمت

نجم الدین حرانی (م ۶۹۵ھ) جامع العلم

محمد بن محمود آملی (م ۷۵۳ھ) نفائس الفنون

شمس الدین محمد انصاری (م ۷۹۴ھ) ارشاد القاصد

شرف الدین اسماعیل مقری (م ۸۳۷ھ) عنوان الشرف

سید میر شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) تعریفات

محمد شاہ فناری (م ۸۳۹ھ) انموذج العلوم

علی بن محمد مصنفک ہروی بسطامی (م ۸۷۵ھ) حل الرموز

عیسیٰ صفی (م ۹۵۳ھ) انموذج العلوم

جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) النقایہ

احمد بن مصطفیٰ طاش کبریٰ زادہ (م ۹۶۲ھ) مفتاح السعادۃ

افضل الدین محمد ترکہ (م ۹۹۰ھ) انموذج العلوم

احمد بن عبدالحق سنباطی (م ۹۹۰ھ) روضۃ المفہوم

محمد بن علی سپاہی زادہ بروسی (م ۹۹۷ھ) انموذج الفنون

قاضی نوراللہ شوشتری (م ۱۰۱۹ھ) انموذج العلوم

ابراہیم ہمدانی (م ۱۰۲۵ھ) الانموذجہ

محمد امین استرابادی (م ۱۰۳۶ھ) دانشنامہ شاہی

حاجی خلیفہ مصطفیٰ بن عبداللہ (م ۱۰۶۷ھ) کشف الظنون

ابوالبقا کفوی (م ۱۰۹۵ھ) کلیات العلوم

آقا رضی قزوینی (م ۱۰۹۶ھ) لسان الخواص

احمد رشید مغربی (م ۱۰۹۴ھ) تیجان العنوان

قوام الدین محمد شیفی قزوینی (م ۱۱۵۰ھ) ارجوزہ

(مقدمہ کتاب محولہ بالا از محمد پروین گنابادی، ص ص: ۳،۴)۔

23. See:-- Nasr, Syed Hussain, An Annotated Bibliography of Islamic Science, 2 Vols, Lahore: Suhail Academy, 1985, (First ed. 1975).

[۲۴] وحیدالدین سلیم، وضع اصطلاحات، کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۵ء ص: ۱۹۔ (طبع اول ۱۹۲۹ء)

[۲۵] ۳۲۔۱۹۳۰ء میں لاہور سے ایک اردو ترجمہ کی چند قسطیں شایع ہوئی تھیں۔ لیکن ابھی تک اردو کا کوئی مکمل ترجمہ سامنے نہیں آیا[۲۶] ہمارے ماخذوں کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانی، شاہد حسین رزاقی، عبدالرزاق ملیح آبادی، ڈاکٹر نثار فاروقی، ڈاکٹر صادق حسین، نیر اقبال مولانا عبدالستار، محمد ایوب قادری کی تحریریں اہم ہیں۔ نیز کوئی صاحب ڈاکٹریٹ بھی کر رہے ہیں۔

کتابیات

۱۔ بھٹی، محمد اسحاق، فقہائے ہند: بارہویں صدی ہجری، جلد پنجم، حصہ دوم، ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۱ء۔

۲۔ تھانوی، محمد اعلیٰ بن علی، کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ: لیز پریس ۱۸۶۲ء

۳۔ " " " طبع ایران، طہران ۱۹۶۸ء

۴۔ " " " طبع قاہرہ مصر، ۱۹۶۳ء

۵۔ راشد کاندھلوی، نور الحسن، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی" فکر و نظر" اسلام آباد، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء۔

۶۔ عثمانی، ڈاکٹر محمد نسیم، اردو میں تفسیری ادب، کراچی: ۱۹۹۴ء

۷۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد: انجمن شرقیہ علمیہ، طبع دوم ۱۹۹۴ء (طبع اول ۱۹۹۳ء)

۸۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو اصطلاحات نگاری، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء

۹۔ لکھنوی، سید عبدالحئی حسنی، نزہۃ الخواطر، حیدرآباد دکن: دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء

۱۰۔ وحید الدین سلیم، وضع اصطلاحات، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء (طبع اول ۱۹۲۰ء)

۱۱۔ وحید اللہ خاں صدیقی، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی، "العلم" کراچی، اپریل تا جون ۱۹۹۴ء۔

12. Nasr, Syed Hussain, An Anotated Bibliography of Islamic Science, Vol 2, Lahore: Sohail Academy, 1985.

13. Riggs, F.U.(1989), Terminology and Lexicography: Their Complementarity, " International Journal of Lexicography, "2 (2), PP: 89-110 -in- Sonneveld, Helmi B & Kurt L. Leoning. Terminology Application in Inter disciplinary Communication Amsterdam: John Benjamin Publishing Co., 1993.

14. Wright. Sue Ellen, Lexicography Versus Terminology, "Termnet News," Vienna, No. 45-- 1994.

تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق

از

ڈاکٹر سید حسن عباس، سیوان۔

مذکورہ رسالہ میر غلام علی آزاد بلگرامی (م: ۱۲۰۰ھ) کے ایک نامور شاگرد میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی (م: ۱۲۰۴ھ) کی تالیف ہے۔ انہوں نے یہ رسالہ محمد صدیق مخنور بلگرامی (م: ۱۲۲۲ھ) کے رسالے "تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد" کے جواب میں لکھا ہے۔ آزاد بلگرامی کی شخصیت اور کارنامے محتاج تعارف نہیں۔ وہ شاعر، ادیب، مورخ اور تذکرہ نگار تھے اور عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور ان میں انھوں نے بیش بہا تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ مگر عام ارباب کمال کی طرح آزاد بلگرامی کو بھی ہدف تنقید و اعتراض بنایا گیا ہے۔

ہر دور میں جن لوگوں نے اپنے پیش روؤں یا معاصرین پر اعتراضات و ایرادات کیے ہیں ان کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کے اعتراض محض برائے اعتراض ہوتے ہیں اور بعض حضرات اپنی علمی فضیلت کے اظہار اور مقابل کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے اعتراض کرتے ہیں لیکن بعض لوگوں کے اعتراضات واقعی محکم اور بجا ہوتے ہیں۔

ان اعتراضات و ایرادات اور نکتہ چینیوں کا مطالعہ ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کی تنقیدی روایت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے اور اس موضوع پر بعض

مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اور بعض کتب تاریخ و تذکرہ میں بھی اس سلسلہ کے بعض اہم نکات دکھائی دیتے ہیں، چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو کی تالیفات تنبیہ الغافلین، دادِ سخن و سراج منیر اور آزاد بلگرامی کی خزانۂ عامرہ میں اس طرح کے نکات موجود ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد آیئے دیکھیں کہ آزاد بلگرامی پر کیا اعتراضات کیے گئے ہیں، ان پر کیے جانے والے اعتراضات دو طرح کے ہیں :

الف : ان کی مشہور کتاب "مآثر الکرام تاریخ بلگرام" پر

ب : ان کی شاعری پر

آزاد بلگرامی کے ناقدین میں شیخ غلام حسن ثمین بلگرامی، مولوی محمد باقر آگاہ مدراسی (م: ۱۲۲۰ھ) محمد صدیق سخنور بلگرامی اور میرزا ابو طالب خان تبریزی اصفہانی لندنی (م: ۱۲۲۰ھ) کا نام ملتا ہے۔

مآثر الکرام ۱۱۵۰ھ میں تالیف کی گئی مگر نظر ثانی کا کام ۱۱۶۶ھ میں دکن میں انجام پایا۔ آزاد نے کتاب کا ایک نسخہ اپنے ماموں میر سید محمد شاعر بلگرامی (م: ۱۱۸۵ھ) کے لیے بلگرام بھیجا تھا۔ جب وہاں کے لوگوں نے مآثر الکرام کا مطالعہ کیا تو عثمانی فرشوری حضرات اس بات پر سخت برہم ہوئے کہ آزاد نے اس کتاب میں سادات حسینی واسطی بلگرامی کو جن کے جد اعلیٰ سید محمد صغریٰ بلگرامی (م: ۶۲۰ھ) ہیں، بلگرام کا اصلی فاتح قرار دیا ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا جواب لکھنا چاہیے اور یہ کام ثمین بلگرامی کو سونپا گیا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۱۵۹ھ میں شرائف عثمانی لکھی۔ بقول ثمین: "آزاد نے مآثر الکرام میں جو غلطیاں کی تھیں انہیں اس کتاب میں صحیح کرکے پیش کیا گیا ہے۔" حالانکہ یہ کتاب ان کے قبیلے کے

بزرگوں کے تذکرے میں ہے جیسا کہ اس کے ابواب کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے، یہ کتاب ایک مقدمہ، دو مطلع اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل اس طرح ہے :

مقدمہ : در ذکر اسلام و قدمائے بلگرام

مطلع اول : در ذکر بعضی فضایل و شہادت حضرت امیر المومنین عثمان و بعضی از اولاد شان کہ در ملک عرب و فارس می باشد۔ در آن دو باب است۔

مطلع دوم : در ذکر احوال قاضی محمد یوسف عثمانی و ذکر تمامی اولاد قاضی مذکور۔ در این مطلع چہار باب است۔

باب اول : در حالات قاضی ابو المکارم مشہور بہ قاضی بھکاری بن قاضی کمال و فرزندان ایشان۔

باب دوم : در بیان شیخ المشائخ شیخ عبد الحیؒ۔

باب سوم : در حالات ملک العلما قاضی با زید بن قاضی عبد الکریم مع تمامی اولاد

باب چہارم : در احوال قاضی مبارک بن قاضی عبد الکافی بن قاضی محمد یوسف مع فرزندان و تمامی اولاد۔

خاتمہ : وقایع در ذکر سلاطین کہ در دہلی سلطنت کردند از عہد سلطان محمود غزنوی غازی تا عہد جلال الدین اکبر شاہ[1]۔

یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ ہے اور اس کے نسخے کتابخانہ آصفیہ (شمارہ ۲۰۲)، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (شمارہ ۲۲۷ D/ ۲۷۷) علی گڑھ (شعبۂ تاریخ،

[1] فہرست الوانعت، ص ۱۱۷ - ۱۱۸ و تاریخ خطۂ پاک بلگرام مولفہ قاضی شریف الحسن بلگرامی ص ۴ - ۵ - ۶۔

اور انڈیا آفس لندن (شمارہ ۸/ ۲۹۱۳) میں موجود ہیں۔

مولوی محمد باقر آگاہ مدراسی کا شمار جنوبی ہند کے متبحر علما میں ہوتا ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ اردو میں بھی کئی کتابوں کے مولف اور شاعر ہیں۔ آزاد بلگرامی سے ان کے مراسم اور خط و کتابت تھی۔ لیکن ایک بار کسی بات پر ناراض ہو گئے اور آزاد پر اعتراضات کی بوچھار کر ڈالی۔ آزاد پر اعتراض میں جو کتاب انہوں نے لکھی وہ "چہار صد ایراد بر کلام آزاد" (عثرات آزادیہ) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آزاد کی غلطیاں نکالی ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۱۹۹ھ میں تالیف کی، اس پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی کا مقالہ مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا۔ یہ کتاب بھی غیر مطبوعہ ہے اور اس کے چھ نسخوں کا علم راقم السطور کو ہے۔

ابو طالب خان لندنی نے بھی آزاد کی شعر فہمی پر اپنے تذکرہ "خلاصۃ الافکار" میں ایک جگہ چوٹ کی ہے بلکہ مذاق بھی اڑایا ہے۔

اب محمد صدیق سخنور بلگرامی پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے گی جس طرح ثمین بلگرامی نے ماثر الکرام کے رد میں شرائف عثمانی تالیف کی تھی اسی طرح محمد صدیق سخنور بلگرامی نے سرو آزاد پر اعتراض کیا، جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آزاد نے ان کا ترجمہ اور ان کے اشعار کا انتخاب بہت مختصر درج کیا تھا۔ جب سخنور نے "سرو آزاد" دیکھی تو برہم ہو گئے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اس مختصر ترجمہ اور انتخاب سے کہیں زیادہ توجہ کے مستحق تھے۔ یہ سوچ کر انہوں نے آزاد کے نام ایک خط لکھا۔ اس کے ساتھ اپنا شرح حال اور اشعار کا ایک انتخاب بھی

بھیجا تاکہ وہ "سرو آزاد" میں سخنور بلگرامی کے پہلے ترجمہ کو بدل کر اس کی جگہ سخنور کا بھیجا ہوا شرح حال اور انتخاب شامل کر لیں۔ سخنور نے اپنے ترجمہ میں خان آرزو سے شرف تلمذ کا ذکر کیا تھا جب کہ آزاد نے انہیں میر نوازش علی نقیر بلگرامی کا شاگرد لکھا ہے۔ جب آزاد کو سخنور کا خط ملا تو انہوں نے سخنور کا ترجمہ تو ان کے حسب دلخواہ بدل دیا مگر اشعار کا انتخاب وہی رہنے دیا جو پہلی بار درج کیا تھا اور یہ لکھ کر انہیں جواب بھیج دیا کہ:

"بی اطلاع فقیر (آزاد) اشعار خود را داخل تحت ترجمہ خویش بہ سرو آزاد نباید کرد نسخہ ہا را مغشوش و مختلف نباید ساخت، و احتمال دارد کہ شعری کہ بی اطلاع فقیر داخل شود سقمی داشتہ باشد و آن سقم عاید بہ فقیر شود و ناظران می گویند کہ مصنف اینقدر علم نداشت کہ از این شعر سقیم احتراز کند در این صورت ستمی بر مولف رفتہ باشد۔"[1]

آزاد کے حسن نیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سخنور کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کا بھیجا ہوا ترجمہ سرو آزاد میں شامل کر لیا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں نہ صرف خان آرزو کا شاگرد لکھ دیا بلکہ ترجمہ میں تھوڑا بہت اضافہ بھی کر دیا۔ لیکن سخنور اس پر راضی نہیں ہوئے اور انہوں نے آزاد کی مذمت میں رسالہ "تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد" لکھا۔ خود سبب تالیف میں لکھتے ہیں:

"من بعد این تنبیہات بی بنیاد کہ از طرف آزاد ارشاد یافتہ متنبہ گردیدہ بستہ دیوان آزاد کہ سرمایہ مدت العمر فکرت او تواند بود پرداختم و بہ نظر اجمال ورق

---

[1] تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد تالیف سخنور بلگرامی ص ۲ (قلمی)

دورق گشتم، سبحان اللہ! چہ مضمونی نیافتم کہ مبتذل نبودہ باشد بلکہ اشعاری کہ ظن فاسد آزاد بہ تازہ مضمونی آنہا بود سراپا مبتذل دیدم و بعینہ مضمون اساتذہ یافتم . . . مع ہذا اکثر جا عیوب فاحش در بادی النظر در آمدند و بالکلیہ اغماض از آن نمودن محل بر نادانی و بی استعدادی بندہ بود، برخی از آن اشعار مشتمل بر عیوب در مرتبت اقدام افکار و تشنگی ہا و ابتذال بودند، بر چیدم و ہر چند بخاطر بندہ نبود کہ بر اشعار آزاد دخلہا کردہ، عَلَم امتیاز بین الاقران برافرازم، اما بیک قلم ہم از آن وادی گذشتن از سخنوری و خیر خواہی بعید العقل می نمود، لاجرم جسارت بر این کار کردم و نسخہ ای مختصر کہ بہ معنیٔ مطول می توان گفت، ای تبصرۂ یاران این فن مجتمع نمودم و "تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد" موسوم ساختم۔[1]

سخنور نے ایک جگہ سرو آزاد پر یہ تبصرہ کیا ہے، جس سے ان کی نیت کا انداز لگایا جاسکتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"از آنجا کہ اکثر جا ترجمۂ حالات شعرا را موافق طبع خود تراشیدہ، بہ تحقیق دقائق پی نبردہ و دریا را تعریف کوزہ و کوزہ را توصیف دریا نمودہ و بعضی کور سوادان وطن را کہ قابل داخل کتاب نبودند سخن شان را درست کردہ بہ سلک سخنوران منسلک ساخت و بسیاری اشعار شعرای سلف و خلق را تغییر دادہ، موافق وقوف و فہم خود پرداخت، و سخن والا رتبہ را بی رتبہ نمودہ سراپا سقیم ساخت پسند طبائع صاحب طبعان و قاد و خواطر سخنوران نقاد نیامد بلکہ تخطیہ ہای فاحش بر آوردند۔"[2]

---

[1] تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد، ص ۴ [2] ایضاً ص ۲-۳۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ آزاد پر اعتراض کا مقصد کیا تھا؟ خود سخنور نے دعوی کیا ہے کہ اعتراض کے لیے انہوں نے ان کے تین دیوان جوان کی پوری عمر کا سرمایہ تھا کھنگال ڈالا لیکن قاری جب یہ دیکھتا ہے کہ سخنور کو آزاد کے صرف انیس[19] اشعار ایسے ملے جن پر انہوں نے نکتہ چینی کی اور مضامین، مفاہیم و تراکیب وغیرہ کے اعتبار سے انہیں تختۂ مشق بنایا ہے تو خود سخنور کی علمی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے رسالے کے مندرجات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ انہوں نے یہ رسالہ دو فصلوں اور ایک خاتمہ میں تالیف کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

فصل اول: در تحقیق عیوب بہ کلام آزاد (اس عنوان کے تحت سخنور نے گیارہ اشعار پر "عیوب" کا عنوان چسپاں کیا ہے)

فصل دوم: تدقیق تشنگی ہا اندر کلام آزاد (اس فصل میں آزاد کے آٹھ اشعار کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے)

خاتمہ: در بیان دخلہای آزاد بہ کلام سخنور (اس میں سخنور کے اشعار پر آزاد کی اصلاح کو غلط بتایا گیا ہے پھر سخنور نے بھی آزاد کے بعض اشعار پر اپنی رائے دی ہے)

سخنور کے پورے رسالے کا اسلوب بیان بہت تلخ و تند ہے اور آخر میں وہ اس کا دعوی کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ رسالہ جب خان آرزو کو دکھایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور میری بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ آزاد کو لکھنا چاہیے کہ وہ اپنے اشعار کو سخنور کی اصلاح کے مطابق کرکے اپنے دیوان میں شامل کرلیں۔ سخنور کی اصل

عبارت یہ ہے:

... درسنہ ثمان وستین ومایۃ والف من الہجرت خان صاحب وقبلہ خدایگان استادی سراج الدین علی خان صاحب المتخلص بہ آرزو مدظلہ ہمراہ پسران نواب اسحٰق خان مرحوم وارد لشکر نواب وزیرالممالک برہان الملک ابو منصور خان صفدر جنگ بہادر مدظلہ العالی گردیدند و نوازش نامہ بہ طلب بندہ عنایت فرمودند، حسب الطلب آن خداوند پا از سر ساختہ بہ لشکر نواب مذکور رفتم و بہ صوبۂ اختر نگر اودہ شرف اندوز ملازمت گردیدم و اصلاح دیوان خود پیش کردم و تا درستی سخن را درست می نمودم و من بعد اصلاح دیوان، نوبتِ عرض این رسالہ [تحقیق السداد...] آمد، پس از نظر اقدس گذرانیدم و صفحہ صفحہ خواندم و طلب صواب کردم و عرض نمودم کہ اگر این ہمہ دخل بندہ بجا باشد بہتر والا این اوراق چند را بہ خوی خجالت بشویم و از گفت پریشان زبان ببندم و من بعد فاعل این چنین فعل نباشم، خدا شاہد است وکفی باللہ شہیدا کہ بر ہر بیت دخل کردۂ بندہ ہزاران ہزار تحسین و آفرین بہ وقتِ طعم فرمودند، وارشاد کردند کہ بہ آزاد باید نوشت کہ اشعار خود را مطابق دخلہای سخنور بہ دیوانِ خود باید نوشت تا از سقم برآمدہ بہ درستی درآیند[1]

سخنور کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ انہوں نے اپنا رسالہ سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی کو ۱۱۶۸ھ میں دکھایا تھا اور انہوں نے ان کے حق میں رائے دی تھی کیونکہ آرزو نے جہاں کہیں آزاد کا ذکر کیا ہے بڑے احترام سے کیا ہے اور

[1] تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد ص ۱۸ - ۱۹۔

ان کی قابلیت کا اعتراف بھی کیا ہے پھر سخنور کے بیان کے علاوہ اس کا کوئی اور ثبوت کہیں سے نہیں ملتا کہ آرزو نے سخنور کے اعتراضات کو اتنا سراہا اور اس کی تاکید کی کہ آزاد کو ان سے مطلع کیا جائے تاکہ وہ اپنے اشعار اپنے دیوان میں درست درج کرلیں۔ مزید براں یہ آرزو کی حیات کے آخری ایام تھے جس کے بعد وہ ۱۱۶۹ھ میں انتقال کر گئے۔ اس دور کی ان کی کوئی ایسی تحریر دسترس میں نہیں ہے جس سے اس بارے میں کوئی اشارہ مل سکے۔ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ آرزو نے سخنور کے رسالے کی کافی تعریف کی تھی تاہم اعتراضات بڑے معمولی اور سطحی ہیں جن کا اطلاق کسی بھی اچھے شاعر کے کلام پر کیا جا سکتا ہے کیونکہ اچھے سے اچھے شاعر کے یہاں بھی چند ایسے کمزور اشعار مل جاتے ہیں جن پر گرفت کی جا سکتی ہے۔

یہ شروع ہی میں بتایا جا چکا ہے کہ سخنور بلگرامی کے اسی مذکورہ رسالے کا جواب آزاد بلگرامی کے شاگرد میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی نے "تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق" میں دیا ہے۔ مہربان اورنگ آبادی نے اس کے آغاز میں ان خطوط کے طویل اقتباسات درج کیے ہیں جو سخنور نے آزاد بلگرامی کے نام لکھے تھے بعض خطوط کے ساتھ آزاد بلگرامی کے جوابات سے بھی اقتباسات پیش کیے ہیں اس کے بعد سخنور نے آزاد کے جن اشعار پر گرفت کی تھی انہیں سخنور کے اعتراض کے ساتھ درج کیا ہے پھر اپنا جواب لکھا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

آزاد بلگرامی: مرا واسوخت چون پروانہ آخر حرف گرم او
ز خوبان جہان آتش زبانی کردہ ام پیدا

اس شعر پر سخنور نے یہ اعتراض کیا کہ "واسوختن، "سوختن" کے معنی میں نہیں

آیا ہے بلکہ بہ معنی "نسوختن" آیا ہے چنانچہ ظہوری نے "خوان خلیل" کے دیباچہ میں فرمایا ہے کہ "یک بیت سوختن و یک بیت واسوختن نباشد" اور خان آرزو نے فرمایا ہے کہ "واسوختن بہ معنی سوختن نیامدہ است"۔

مذکورہ اعتراض کا جواب خود آزاد نے یہ دیا ہے کہ :

"آنچہ از استادان استماع یافت واسوختن بہ معنی باز سوختن است یعنی دوبارہ سوختن مثل سوختن انگشت وجوہر لفظ ہم ہمین معنی رامی خواہد" وا "بہ معنی باز آمدہ، چون" دیدو وادید "شیخ نظامی در ظلم دارا گوید :

زخلق آنچنان برد پیوندرا | کہ سگ وا نبیند خداوندرا

وصاحب فرہنگ رشیدی گوید : وا بہ معنی باز نیز آمدہ، نجیب الدین جرباد قانی گوید : ۔

"ہزار عاشق گم گشتہ واتوانی یافت"

وحاصل معنی واسوختن، تمام سوختن است، چہ در آتش اول قول در انگشت باقی می ماند و در آتش ثانی تمام سوختہ خاکستر می شود باید رخان گوید :

گویند داغ سوز کہ واسوزی از غمش | خودرا تمام سوختم و وانسوختم ہیئلہ

آزاد کے جواب کے بعد مہربان نے لکھا ہے کہ :

"صدیق کلام ملا ظہوری را دیدہ" در غلط افتاد ومعنی ایجابی واسوختن رانفی ومعنی سببی را اثبات کرد"[۲]

آزاد بلگرامی : حرف دنیا در کتاب سینہ شایان حک است
گرکنی الحاق در قرآن سزای کزلک است

---

[۱] تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق ص ۱۲۔ ۱۳ (قلمی)

اعتراض سخنور : سینہ راکسی تشبیہ بہ قرآن نکردہ مگر تشبیہ دل بہ قرآن آمدہ است میرزا صائب راست ؟

چیست اسباب جہان تا دل بآن بندد کسی | میکنی زنار رد شیرازہ قرآن چرا

آزاد نے اس کے جواب میں کہا کہ "سینہ" کو "کتاب" کہا گیا ہے نصیر ہمدانی :

زریب سینۂ پُر داغ بوالہوس نخوری | کہ این کتاب غلط نقطہ ہای شک دارد

"وظاہر است کہ اول کتاب سینہ گفتہ شد بعد از آن اطلاق قرآن براو نمودہ شد بر مطلق سینہ اطلاق قرآن در این جانیست چنانچہ معترض فہمیدہ مع ہذا اگر مطلق سینہ را قرآن گویند چہ مضائقہ ؟ چہ زبان زد خاص وعام است کہ : "علم در سینہ بکہ در سفینہ" وفتی کہ سینہ را محل علم گفتند واطلاق کتاب بر آن کردند، اگر کسی استعارۂ قرآن کہ کتاب اللہ است کند، چہ مضائقہ کہ باب استعارہ مسدود نیست وکتاب اللہ وکتاب الناس در ہیچ صورت تفاوت ندارد"[۱]

سخنور نہ تو ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ آزاد سے اپنی شاعری کا مقابلہ کرتے اور نہ ہی ایسے نقاد کہ آزاد کے اشعار پر گرفت کر سکتے تھے کیونکہ اوائل میں آزاد کو وہ اپنا کلام بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے اور جس وقت آزاد سرو آزاد کی تالیف میں مشغول تھے اس وقت بھی انہوں نے آزاد کو اپنے کافی اشعار بھیجے تھے جن میں سے آزاد نے بہ مشکل چار اشعار کا انتخاب کیا اور اس میں بھی اصلاح کی۔ اس سے سخنور کے اعتراض کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ خود کو صف اول کے شعرا میں شمار کرتے تھے مگر آزاد نے ان کے اشعار اس قابل ہی نہیں سمجھے کہ چار سے زائد اشعار سرو آزاد

---

[۱] تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق ص ۲۳۔ ۲۴۔

میں شامل کریں۔ جس پر سخنور چراغ پا ہوگئے اور آزاد کی مذمت میں رسالہ لکھ ڈالا۔

اس کے مقابلے میں آزاد کی بردباری، صبر و تحمل، متانت اور شرافت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب سخنور کا رسالہ ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کوئی رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے صرف یہ کہا :

"اگر او زبان خود را دراز کرد ما زبان خود را کوتاہ کنیم"۔

انھوں نے اس زبان بندی کے چار وجوہ بتائے ہیں :

۱۔ ہمارے جد بزرگوار حضرت علیؓ کا طرز عمل یہی رہا ہے۔

۲۔ شعر و شاعری کا تعلق نہ دین سے ہے نہ دنیا سے پھر کسی نااہل کا فریق بنکر کیوں اپنا قیمتی وقت ضایع کیا جائے۔

۳۔ اس کا کلام نہ معتبر ہے اور نہ کسی مرتبہ کا حامل، پھر کیوں اس کی تردید کی جائے۔

۴۔ تجربہ یہ ہے کہ کسی شاعر نے کسی شاعر پر جب بھی اعتراضات کیے ہیں تو بعد میں کسی نہ کسی نے اس کا انتقام لیا ہے۔ مثلاً شیدا نے قدسی پر لعن طعن کیا تو جلالا طباطبائی نے اس کا انتقام لیا، منیر لاہوری نے قدسی اور شیدا کا محاکمہ کیا اور سراج الدین علی خاں آرزو نے منیر کا محاکمہ کیا حالانکہ قدسی کا ان اعزہ کی گردنوں پر کوئی حق نہیں تھا ان سب کا مقصد اپنی طبع آزمائی تھی۔ جب غیب سے انتقام کا انتقام ہو جائے گا تو بہتر ہے کہ ہم اپنی زبان کو ناسزا گوئی سے محفوظ رکھیں اور اسے اس کے عمل پر چھوڑ دیں۔[1]

[1] تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق ص ۳۰-۳۱۔

مہربان اورنگ آبادی کہتے ہیں کہ جب میں نے چوتھی اور آخری وجہ سنی تو پھر سخنور کے رسالے کا جواب لکھنے پر کمر ہمت باندھ لی اور اپنا جواب "تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق" کے نام سے لکھا البتہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں :

"دل نہیں چاہتا تھا کہ زبان قلم کو جو نہایت عفت کی حامل ہے ان الفاظ سے آلودہ کروں لیکن کیا کروں کہ اس نے ظلم کیا اور میں انتقام لے رہا ہوں"[1]

اس کے بعد مہربان اورنگ آبادی نے سخنور بلگرامی کے ایک ایک اعتراض کا شافی اور کافی جواب دیا ہے مثالوں میں اساتذہ کے اشعار کی بھرمار کر دی ہے اور ہر اعتراض کا جواب دے کر سخنور کو لاجواب کر دیا ہے۔ یہ دونوں رسالے نقد شعر کی تاریخ کا جزو ہیں اور ان کے مطالعے سے شاعری کے اسرار و رموز اور درپردہ حقائق کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ راقم السطور نے دونوں رسالوں کے دو مکشوفہ نسخے حاصل کر لیے ہیں اور تصحیح متن کا کام بھی مکمل کر لیا ہے تعلیقات و حواشی کے بعد اگر یہ زیور طبع سے آراستہ ہو جائے تو خاصے کی چیز ثابت ہوگی۔

سخنور بلگرامی نے صرف خود کے لیے مشکل پیدا نہیں کی تھی بلکہ اپنے ہم قبیلہ صانع بلگرامی کو بھی اپنے اور آزاد کے تنازعہ میں الجھالیا تھا۔ کیونکہ آزاد نے صانع اور سخنور دونوں کے کلام میں اصلاح کی تھی۔ مہربان اورنگ آبادی نے صانع اور سخنور کے کلام پر آزاد کی اصلاح کے چند نمونے دیے ہیں جن کا ذکر سخنور نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ :

"آزاد بسیاری از اشعار شعرای سلف و خلف را تغییر داده موافق وقوف و فہم

[1] تادیب الزندیق۔ ص ۳۱

خود ساختہ، سخن والا رتبہ را بی رتبہ نمودہ و سراپا سقیم ساخت پسند طبائع صاحب
خبدان وقاد و جواہر سنجان نقاد نیامدہ تاکہ تحلیہ ای فاحش برآوردند۔"

اب پہلے صانع بلگرامی کے اشعار اور ان پر آزاد کی اصلاح ملاحظہ ہو :

صانع بلگرامی : نقش روی یار مانی از قلم کاری کشید
چون نظر بر چشم او افگند بیماری کشید

مہربان اورنگ آبادی نے لکھا ہے :

"حضرت میر (آزاد) لفظ "قلم کاری" را برآوردند و چنین اصلاح کردند :

نقش روی یار را مانی بہ مو کاری کشید (الیٰ آخرہ)"

(۲) صانع بلگرامی : یک نظارہ چشمش کشتگان را زندہ می سازد
مگر دادند اعجاز مسیحا این فرنگی را

"حضرت میر فرمودند : اعجاز مسیحا بہ نفس بود نہ بہ نظارہ و نیز اگر صفت کافر
بچشم در مصراع اول ثابت شود اولیٰ و اصلاح چنین کردند :

بہ حرفی کشتگان را زندہ سازد کافر چشمت الیٰ آخرہ۔"

(۳) صانع بلگرامی : میپوش چشم خود از روی دلبران زاہد
کسی کہ منکر مصحف بود مسلمان نیست

"حضرت میر بجای دلبران، نوخطان ساختند و ہر سہ بیت را بعد (از) اصلاح
در سرو آزاد ثبت نمودند۔"

اس کے علاوہ بھی صانع نے اپنا کچھ کلام آزاد کو بغرض اصلاح بھیجا تھا جن پر
آزاد نے اصلاح کی تھی اور اسے واپس بھیجا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ صانع کا تذکرہ اچھے

الفاظ میں کیا جبکہ اس نے آزاد کے حق میں انصاف نہیں کیا۔

سخنور بلگرامی کے شعر پر آزاد کی اصلاح ملاحظہ کیجئے :

سخنور بلگرامی : میشود سرمایۂ نازان تغافل پیشہ را
ہر چہ از اسباب نیاز من بہ غارت می رود

"حضرت میر چنین اصلاح کردند :

میشود سرمایۂ نازآن سپاہی پیشہ را
ہر چہ از جنس نیاز من بہ غارت می رود

لفظ سپاہی برای غارت مناسب افتاد اما این شعر را چہ نسبت بہ شعر میر خوش
کہ می گوید :

آنچہ کم از طاقت ما شد بہ تمکینش فزود
صبر ما بردند و در چشمش تغافل ساختند

سخنور نے اپنے رسالے میں دعویٰ کیا ہے کہ آزاد نے وطن کے شعراء کے
کلام میں تصرف کر کے سرو آزاد میں داخل کیا ہے جبکہ مہربان نے لکھا ہے کہ سخنور ان
کے پانچ اشعار سرو آزاد میں شامل ہیں جن میں آزاد نے کوئی تصرف نہیں کیا ہے[1]

---

[1] تادیب الزندیق ... ۱۱۳ ۔ ۱۱۵ ۔ ۱۱۷ ۔

اقبال کی ایک غزل کا تشریحی تجزیہ

از جناب تاج پیامی صاحب آرہ

اقبال بیسویں صدی کے ایک نابغۂ روزگار شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمت مسلّم ہے۔ انہوں نے اقدام و عمل، انسان کی عظمت اور خودی کا درس دیا ہے اور حیات و کائنات کی حر کی تعبیر کی ہے۔ ان کے یہاں فکر و فن شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے نظم کے پیمانے کو مئے تغزل سے لبریز کر دیا۔ خضر راہ، ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ ہر لحاظ سے اعلیٰ پایہ کی نظمیں ہیں۔

اقبال نے غزل کی دنیا میں بھی اجتہاد کیا۔ انھوں نے غزل کی ہیئت و روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کئی طرح سے توسیع کی۔ ان کی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں بالِ جبریل کی بہت سی غزلیں دعائیہ ہیں۔ انہوں نے غزل کو فلسفیانہ خیالات سے مالامال کیا اور ایسی نادر تشبیہات اور ایسے عجیب استعارات سے آشنا کیا جن سے یہ پہلے ناآشنا تھی۔

غزل کی روایت فارسی سے اردو میں آئی لیکن اقبال کی غزل کا آہنگ عجمی نہیں حجازی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں :

مرا سازا گرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اقبال نے عجم کی انفعالی لے کو خیر باد کہہ کر، حجازی لے اختیار کی۔ عجم کا گلستاں

سکون چاہتا ہے اور عرب کا صحرا دعوتِ اقدام و عمل دیتا ہے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں بھی اقدام و عمل، جد و جہد اور تلاش و جستجو سے متعلق خیالات پیش کیے، ان کی بلند نگاہ نے غزل کو زندگی کی عظمت اور اظہار کی تازہ توانائی سے ہمکنار کیا۔ وہ اپنی غزلوں میں خدا سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اس لہجہ اور اس انداز سے سوال کرتے ہیں جس میں ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ صحیح کہتے ہیں ع ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

اقبال نے ابتدا میں چند غزلیں داغ کے رنگ میں کہیں۔ وہ شاد عظیم آبادی سے بھی متاثر ہوئے۔ شاد کا شعر ہے :

چشمِ سیہ میں سرمہ دے زلف میں شانہ کر قتلِ جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اب اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں شاد کا رنگ و آہنگ نہیں ہے ؟ اقبال نے غزلوں میں براہ راست تخاطب کا انداز بھی شاد عظیم آبادی سے حاصل کیا۔

اقبال نے غزل کی تنگنائے کو وسعت بخشی اور اس کو نئے اسلوب، نئے مضامین نئے استعارات اور نئی تشبیہات اور تلمیحات سے سرمایہ دار بنا دیا۔ صرف ایک شعر ملاحظہ ہو :

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

اس پس منظر میں اب اقبال کی مندرجہ ذیل غزل کا تشریحی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے :

غزل

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یا رب! لامکاں تیرا ہے یا میرا

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر — مجھے معلوم کیا! وہ راز داں تیرا ہے یا میرا

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن — زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

تشریح سے قبل یہ شعر ملاحظہ ہو:

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال — کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

بال جبریل کی مذکورہ غزل اور یہ شعر فارسی اور اردو غزل کی روایت سے بالکل الگ ہے اس میں عجم کا انفعالی لہجہ نہیں ہے بلکہ حجاز کا بیباکانہ آہنگ ہے۔ فارسی اور اردو شعرا بھی خدا سے مخاطب ہو کر شعر کہتے ہیں مثلاً خیام اور غالب مگر اس جرأت کے ساتھ نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں انسان کو ایک حقیر مخلوق تصور کرتے ہیں جبکہ اقبال خدا کے بعد انسان کو سب سے اعلیٰ مخلوق سمجھتے ہیں، انسان خالق کائنات اور دوسری مخلوقات کے درمیان کی کڑی ہے یعنی انسان، حیوانات، نباتات، جمادات، اجرامِ فلکی وغیرہ سے بہتر اور اشرف مخلوق ہے۔

زیر مطالعہ غزل کا اسلوب خشک نہیں بلکہ دلکش ہے اور حیرت خیز بھی کیونکہ اردو غزل ایسے اسلوب سے ناآشنا تھی۔ یہ غزل اقبال کے وسیع مطالعہ کی نمائندہ ہے، مذہبی تلمیحات، اجرامِ فلکی سے واقفیت اور دنیا کے حالات کو غزل کے قالب میں ڈھالنا اقبال کا شاعرانہ کمال ہے۔ یہ غزل اپنے آہنگ اور موضوع دونوں لحاظ سے

اجتہادی ہے۔ فرماتے ہیں:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اس شعر میں آسمان اور زمین کی بات کہی گئی ہے۔ آسمان پر انسان نہیں بستے زمین پر بستے ہیں مگر دونوں جگہ کج روی ہے، خرابی ہے۔ آسمان میں انجم یعنی ستارے ہوتے ہیں اور وہ بھی کج رو ہیں۔ وہ ٹیڑھی میڑھی چال چلتے ہیں، سیدھی راہ نہیں چلتے۔ ماہرینِ فلکیات جانتے ہیں کہ ستارے اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں اور مدار، دائرہ اور حلقہ کو کہتے ہیں، جس کی شکل بیضوی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ستارے کج رو ہیں، شاعر خدا سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ تو خالق ہے اور یہ آسمان اور اس کے ستارے بھی تیرے پیدا کردہ ہیں اگر یہ ستارے ٹیڑھی چال چلتے ہیں تو اس کا ذمہ دار میں نہیں۔ دوسرے مصرع میں بھی شاعر صحیح کہتا ہے کہ "مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟" کیونکہ یہ جہاں یعنی دنیا بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اگر اس میں خرابی ہے تو اس کی فکر خدا ہی کو ہونی چاہیے، دنیا کی خرابی سے مراد اہلِ دنیا کی کج روی ہے۔ آسمان کے انجم کی طرح اہلِ زمین بھی کج رو ہیں۔ جب سے دنیا قائم ہے یعنی قابیل نے جب سے ہابیل کو قتل کیا اس وقت سے آج تک انسان اس سرزمین پر فتنے پھیلا رہا ہے اور خونریزیاں کر رہا ہے۔ خدا کلام پاک میں کہتا ہے:

"اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں، فرمایا مجھے وہ معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔"

خدا وہ بھی جانتا ہے جو فرشتے نہیں جانتے یعنی دنیا میں نیک لوگ بھی ہوں گے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انسان دنیا میں فتنے پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا۔ اسلیے فکرِ جہاں خدا ہی کو ہونی چاہیے۔

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی   خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا

خدا سے اس بیباکانہ انداز سے خطاب اردو یا فارسی کے کسی شاعر نے اقبال سے پہلے نہیں کیا۔ شاعر کی جرأت ملاحظہ ہو: "خطا کس کی ہے یارب!" یعنی شاعر خود خدا ہی سے پوچھتا ہے اگر تیرا لامکاں ہنگامہ ہائے شوق سے خالی ہے تو اس میں کس کی خطا ہے!؟ اس شعر میں اقبال نے خدا کو "یارب!" کہہ کر مخاطب کیا ہے یا الٰہی یا اے خدا کہہ کر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رب کے معنی ہے، پلنے والا اور کسی کو پالنے کے لیے مکان کی ضرورت ہے ہوا اور آب و دانہ چاہیے۔ ان کی تلاش و جستجو سے ہی ہنگامۂ شوق قائم ہے۔ اقبال کہنا چاہتے ہیں اے انسانوں کے پالنے والے میرا مکان ہنگامۂ شوق سے بھرا ہوا ہے۔

خدا کی تعریف یہ ہے کہ وہ یکتا ہے' واحد ہے۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا۔ نہ اسے ہوا کی ضرورت ہے نہ آب و دانہ کی۔ ایسی صورت میں ہنگامہ ہائے شوق کیسے پیدا ہوگا۔ خدا کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، وہ محدود نہیں ہو سکتا۔ کسی شاعر کا مصرع ہے ؂ محدود نہ ہونے کی یہ حد ہے کہ احد ہے

خدا احد ہے اس لیے لامحدود ہے اور جو لامحدود ہے اس کے لیے مکاں کا تصور نہیں کیا جا سکتا وہ لامکاں کا قیوم ہے۔

شاعر دنیا کے ہنگامہ ہائے شوق کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے اہلِ دنیا کے پالنے والے

تجھے قدرت تھی کہ اپنے لامکاں میں بھی ہنگامہ ہائے شوق پیدا کرتا! اگر ہنگامہ ہائے شوق سے تیرا مکاں خالی ہے تو اس میں میری خطا نہیں کیونکہ لامکاں تیرا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کو ایسا خیال پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر ہنگامہ ہائے شوق کو پسند کرتا ہے۔ اقبال مسجد قرطبہ میں کہتے ہیں:

عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں   گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا   اسکو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!

یہ تو فرشتوں کی بات ہے، اقبال مقام بندگی دے کر شان خداوندی بھی لینا نہیں چاہتے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی   مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

ہنگامہ ہائے شوق اور درد و سوزِ آرزو مندی ایک ہی چیز ہے جسے اقبال متاعِ بے بہا کہتے ہیں اور اسی سے لامکاں خالی ہے۔

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر   مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

اس شعر میں لفظ "اُسے" ابلیس کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ ابلیس ہی کو انکار کی جرأت ہوئی تھی۔ جو شخص قرآن میں مذکور واقعہ سے واقف نہیں اسے اس شعر کو سمجھنے میں دقت ہوگی۔ وہ واقعہ یہ ہے: "اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہوگیا۔" ابلیس فرشتوں کا معلم تھا۔ معلم الملکوت۔ قرآن کے متن سے ظاہر ہے سجدہ کا حکم اسے بھی تھا لیکن اس نے خدا کے حکم کو نہیں مانا۔ حکم کو نہ ماننے والا منکر ہوتا ہے۔

قرآن کہتا ہے "غرور کیا" مفسرین کہتے ہیں ابلیس کا کہنا تھا کہ وہ آگ کا بنا ہوا ہے اور آدمؑ مٹی کے۔ وہ اپنے کو آدمؑ سے بہتر سمجھتا تھا اس لیے غرور کیا۔ حکم کے باوجود سجدہ نہیں کیا اس لیے کافر ہو گیا۔

یہاں صبحِ ازل کی ترکیب بہت موزوں ہے۔ خدا نے کتنی مخلوقات پیدا کی ہیں کہنا مشکل ہے لیکن آدمؑ کی تخلیق کے فوراً بعد ہی سجدہ کا حکم ہوتا ہے اس لیے اس وقت کو صبحِ ازل کہنا بہت مناسب ہے۔

فرشتے جو نوری ہیں انہوں نے آدمؑ کو سجدہ کیا لیکن ابلیس جو ناری ہے اس نے سجدہ نہیں کیا۔ اقبال کو حیرت ہے کہ آخر ابلیس کو انکار کی جرات کیونکر ہوئی؟ اسکا جواب بھی اس شعر میں ہے۔ اقبال نے اس شعر میں لفظ "رازداں" قافیہ برائے قافیہ استعمال نہیں کیا ہے۔ قرآن کے متن سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ابلیس خدا کے کسی راز سے واقف تھا لیکن بعد کی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے بی بی حوّا کو اپنے راز میں لے لیا۔ بی بی حوّا اور آدمؑ کو اس درخت کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو گیا جس کے پاس جانے سے خدا نے انہیں منع کیا تھا وہ ابلیس کے بہکانے میں آ گئے اور ان کا زوال ہوا۔ ابلیس پہلے ہی خدا کے راز کو نہ جانتا ہو لیکن آدمؑ کے راز کو ضرور جانتا تھا یعنی وہ انکی کمزوریوں سے واقف تھا جس بات کو فرشتے جانتے تھے اسے ان کا معلم بھی جان رہا ہوگا۔ اقبال نے اسی معنی میں لفظ "رازداں" استعمال کیا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ ابلیس نے خداوند قدوس کے جاہ و جلال کی قسم کھا کر کہا کہ چند نیک بندوں (انبیاء، شہداء، صدیقین، صالحین) کو چھوڑ کر باقی کو گمراہ کر دوں گا۔

اقبال کہتے ہیں "مجھے معلوم کیا!" یہ حسنِ تعلیل ہے یعنی جان بوجھ کر انجان بننا۔ ابلیس نے

خدا کے حکم سے انکار کی جرات محض اس لیے کی کہ وہ انسان کے راز کو جانتا تھا وہ قابیل کے وقت سے لے کر آج تک انسانوں کو گمراہ کر رہا ہے اور انسان فتنے اور خونریزیوں میں مبتلا ہیں۔

چوتھے شعر سے پہلے پانچویں شعر کی تشریح مناسب ہے جو یہ ہے:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

کوکب، آدمؑ کا استعارہ ہے اور آدم ہی کی وجہ سے دنیا میں ہنگامہ ہائے شوق برپا ہے۔ درد و سوز آرزومندی ہے اور سوز و گداز سجود ہے۔ تخلیق کے بعد آدمؑ بی بی حوّا کے ساتھ جنت میں رہا کرتے تھے لیکن ابلیس نے انہیں بہکایا اور وہ انہیں شجر ممنوعہ کے پاس لے گیا جس کے پاس جانے سے خدا نے انہیں منع کیا تھا۔ کہتے ہیں بی بی حوّا اور آدمؑ نے اس کے پھل کھائے اور یہیں سے زوال آدمؑ شروع ہوا خدا ان سے ناراض ہوا اور انہیں دنیا میں ایک مدت تک کے لیے بھیج دیا۔

شاعر یہاں جاننا چاہتا ہے کہ آدم خاکی کے زوال سے نقصان انسان کا ہوا یا خدا کا؟ بظاہر آدمؑ کا جنت سے نکالا جانا زوال آدمؑ کی علامت ہے۔ ابلیس کے بہکانے میں آکر فتنہ برپا کرنا خونریزیاں کرنا اور پھر دوزخ کی سزا جھیلنا وغیرہ۔ لیکن آدم کا زوال نہیں ہوتا تو وہ دنیا میں نہیں آتے اور یہاں کے ہنگامہ ہائے شوق سے محروم رہ جاتے۔ جنت میں وہ احساس کی دولت سے محروم تھے جبکہ دنیا میں انہیں درد و سوز آرزومندی کی متاع بے بہا حاصل ہے اور ساتھ ہی انہیں سوز و گداز سجود بھی میسر ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال مقام بندگی دے کر شان خداوندی نہیں لینا چاہتے اور جنت تو وہ اپنے عمل سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

کیونکہ ع چپچے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں۔

آدمؑ کو فردوس یعنی جنت بخشی گئی تھی۔ اب اُسے یہ سوز و گداز سجود کے بدلہ میں ملے گی
زوال آدم خاکی سے نقصان انسان کا نہیں ہوا وہ تو فائدہ میں رہا۔ اقبال کا ایک اور
شعر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے نقصان خدا کا ہوا۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں　　　کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

باغ بہشت میں سناٹا چھا گیا۔ اس سلسلے میں اقبال کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

زوالِ آدمِ خاکی "در حقیقت" عروجِ آدم خاکی" ہے۔

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی تیرا　　　مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اس شعر کے پہلے مصرع میں محمدؐ، جبریل اور قرآن کی بات کہی گئی ہے دوسرے
صحیفوں اور پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محمدؐ آخری پیغمبر ہیں
جن پر جبریلؑ خدا کا آخری صحیفہ قرآن لے کر حاضر ہوئے۔ اقبال اقرار کرتے ہیں کہ یہ تینوں
خدا کے ہیں۔ پہلا مصرع بالکل صاف ہے دوسرے مصرع میں لفظ "یہ" کے بارہ
میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قرآن کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ
قرآن کے ساتھ محمدؐ بھی اور کسی حد تک جبریلؑ بھی خدا کے ترجمان ہیں اس لیے "یہ"
کا لفظ قرآن کے لیے نہیں آیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اوپر کے مصرع کو مگر سے
الگ کیا گیا ہے یعنی شاعر کوئی نئی بات کہنا چاہتا ہے اب دو ترکیبیں بنتی ہیں "یہ
حرفِ شیریں" اور شیریں ترجمان اگر "یہ حرف" کو شیریں ترجمان مان لیا جائے تو غلط
ہوگا کیونکہ کوئی حرف یا کلام قرآن کے مقابلہ میں شیریں ترجمان نہیں ہو سکتا اسلیے

"یہ حرف شیریں" کی ترکیب درست ہے۔ اقبال نے "یہ" کا لفظ اپنی شاعری
کے لیے استعمال کیا ہے جسے وہ "حرف شیریں" کہتے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ
نظم اور نثر میں خدا کی تعریف اور توصیف بیان کر رہے ہیں انہیں حرف شیریں
کہہ سکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنے کارناموں کو اپنا کہہ سکتا ہے
یا نہیں؟ اقبال جبریہ عقیدہ کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک خدا نے انسان کو
قادر بنا کر بھیجا ہے۔ اقبال خالق دو جہاں سے کہتے ہیں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

یعنی تو نے رات پیدا کی تو میں نے چراغ پیدا کیا۔

اب مذکورہ شعر کی طرف آتے ہیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے
اور "حرف شیریں" اقبال کا کلام ہے۔ یہ حرف شیریں یعنی اقبال کا کلام کس کا ترجمان
ہے۔ خدا کا یا اقبال کا؟؟ اقبال جانتے ہیں کہ محمدؐ کے بعد اب کوئی اور پیغمبر نہیں
آنے والا۔ آپؐ کی حدیث ہے "میرے بعد کوئی نبی نہیں" اور قرآن کے بعد جبریلؑ کوئی
دوسرا آسمانی صحیفہ لے کر نہیں آئیں گے۔ اس لیے اب خدا کا ترجمان یہ حرف
شیریں ہے۔ یعنی اقبال کا کلام۔ اور یہ بات صحیح اور درست بھی ہے کیونکہ
اس غزل کے ساتھ ہی اقبال کا بیشتر کلام خدا کا ترجمان ہے۔ اسی لیے
لوگ اقبال کو شاعر اسلام بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے
کہ اقبال نے فکر و فن کو ہم آہنگ کر دیا ہے اور یہ ان کی شاعرانہ عظمت کا
ثبوت ہے۔

تلمیحات و اشارات خواجہ حافظ شیرازی

از محمد ذاکر حسین ندوی۔ مدھوبنی۔

تلمیح عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی کسی کی طرف اشارہ کرنے کے ہیں۔ علم بدیع کی اصطلاح میں کسی قصہ یا کسی معروف و مشہور مثل کی طرف اشارہ کرنے یا علمی و فنی اصطلاحات کے استعمال کرنے کو تلمیح کہتے ہیں (فرہنگ فارسی از دکتر محمد معین ۱/ ۱۱۳۵)

زمانہ قدیم میں جس طرح انسان کی زندگی اور اس کے خیالات و افکار بالکل معمولی اور سادہ تھے۔ اسی طرح اس کی گفتگو اور تحریر میں بھی سادگی تھی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ترقی کی رفتار تیز ہوئی تو لوگوں کے خیالات میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ گذرے ہوئے واقعات و حادثات، قصے اور کہانیوں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ ان قصوں اور کہانیوں کو اگر بار بار گفتگو یا تحریر میں دہرایا جائے تو طوالت کے علاوہ ناگوار خاطر اور اکتاہٹ کا باعث بھی ہوگا۔ اسی بے لطفی اور تضیع اوقات سے بچنے کے لیے شاعروں اور انشاپردازوں نے خاص خاص لفظوں اور معنی خیز اشاروں کا پر لطف اختراع کیا۔ جس کو ادب کی زبان میں تلمیح کہا جاتا ہے: چنانچہ اردو لغت میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ "کلام میں کسی مشہور مسئلے، حدیث، آیت قرآنی یا قصے یا مثل یا کسی اصطلاح علمی و فنی وغیرہ کی طرف اشارہ کرنا جس کو سمجھے بغیر مطلب واضح نہ ہو (اردو لغت ۵/ ۴۹) علامہ شبلی نعمانی اپنی شہرہ آفاق کتاب شعر العجم میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعے سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صنعت ہے۔" (شعر العجم ۱/ ۹۰)

تلمیح کی اس تعریف و تشریح سے اس کی حقیقت، اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ دراصل طوالت سے بچنے کے لیے یہی وہ واحد ذریعہ اختصار ہے جس سے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی شاعر، ادیب یا انشاپرداز اپنے کلام میں آب حیات، آتش نمرود، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں وغیرہ تلمیحات کا ذکر کرتا ہے تو فوراً سامع اور قاری کا ذہن ان واقعات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو ان تلمیحات میں پنہاں ہوتے ہیں اور ماضی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔

خواجہ حافظ شیرازی ایک صوفی مشرب شاعر تھے جن کے یہاں حقیقت و مجاز کا عجیب سنگم پایا جاتا ہے۔ اُن کے اشعار میں نکات قرآنی، لطائف حکما اور تاریخی واقعات و حقائق بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ خود حافظ کے ایک شعر سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے ؎

ز حافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد ‌ ‌ ‌ لطائف حکما با نکات قرآنی

حافظ کے اشعار میں قرآنی آیات اور حدیث نبوی کی تلمیحات اس کثرت سے ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی اور وسیع معلومات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ اشعار میں ان امور کی طرف صرف اشارات کیے گئے ہیں اور تلمیحات پوری شرح و بسط کا کام نہیں دے سکتیں اس لیے جو لوگ ان سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اس حصے سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں حافظ کی تلمیحات

کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

آب حیات : ایک خیالی چشمہ جس کا پانی پینے سے انسان ابدی حیات حاصل کر لیتا ہے۔ حضرت خضرؑ اور سکندر اعظم نے اس چشمہ کی تلاش میں بحر ظلمات تک کا سفر کیا۔ حضرت خضرؑ اس کا پانی نوش فرما کر زندۂ جاوید ہو گئے اور سکندر کو محرومی کا سامنا کرنا پڑا ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

آب حیوان : آب حیات ہی کا دوسرا نام ہے ؎

آب حیوان تیرہ گون شد خضر فرخ پی کجاست
گل بگشت از رنگ خود باد بہاران را چہ شد

آب خضر : آب حیات حضرت خضرؑ کے حصہ میں آیا اس لیے اس کو آب خضر بھی کہا جاتا ہے ؎

فیض ازل بزور و زر ار آمدی بدست
آب خضر نصیبۂ اسکندر آمدی

آب زندگی : اس سے بھی آب حیات مراد ہے ؎

معنی آب زندگی و روضۂ ارم
جز طرف جویبار و می خوشگوار چیست

آبی : آب حیات ہی کے معنی میں کنایتاً استعمال ہوتا ہے ؎

سکندر را نمی بخشند آبی
بزور و زر میسر نیست این کار

آتش خلیل : حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی تعلیم سے بیزار ہو کر نمرود نے ان کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا اور اسی میں حضرت خلیلؑ ڈلوا دیا مگر حکم خداوندی سے وہ آگ ایک تر و تازہ اور نکہت بیز گلزار میں تبدیل ہو گئی۔ قرآن شریف میں ہے "قُلْنَا یَا نَارُ کُونِی بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ"

آتش خلیل سے وہی آگ مراد ہے ؎

یارب این آتش کہ بر جان من ست
سرد کن زانسان کہ کردی بر خلیل

آتش طور : حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر جو آگ نظر آئی اسی کو آتش طور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کلام پاک میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت ہے " اِنِّیْ آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْ آتِیْکُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ" یہ آگ دراصل اللہ تبارک و تعالیٰ کا نور تھی ؎

مدد ی گر بہ چراغی نکند آتش طور
چارۂ تیرہ شب وادی ایمن چہ کنم

آتش موسیٰ : آتش طور کو ہی آتش موسیٰ کہا جاتا ہے۔

یعنی بیا کہ آتش موسیٰ نمود گل
تا از درخت نکتۂ توحید بشنوی

آتش نمرود : آتش خلیل کا دوسرا نام ہے ؎

بباغ تازہ کن آئین دین زردشتی
کنون کہ لالہ برافروخت آتش نمرود

آتش وادی ایمن : چونکہ کوہ طور ہی وادی ایمن ہے اور اسی وادی میں حضرت موسیٰؑ کو درخت پر آگ نظر آئی۔ اسی لیے اس آگ کو آتش وادی ایمن بھی کہا جاتا ہے ؎

ز آتش وادی ایمن نہ منم خرم و بس
موسیٰ اینجا بہ امید قبسی می آید

آخر الدواء الکی : یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آخری علاج داغنا ہی ہے۔ حافظ نے اپنے کلام میں اسے تلمیحاً استعمال کیا ہے ؎

بصوت بلبل و قمری اگر نہ نوشی می
علاج کی کنمت آخر الدواء الکی

آدم : عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مٹی کے ہوتے ہیں۔ حضرت آدمؑ

پہلے انسان ہیں جو مٹی سے پیدا کیے گئے اور انہی کی ذات سے نسل انسانی وجود میں آئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو بہشت میں جگہ دی اور گیہوں[1] (توریت کی روایت کے مطابق سیب) کھانے سے منع کیا تھا۔ لیکن ابلیس کے بہکانے سے انہوں نے اس پھل کو کھا لیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ظاہر ہوئی اور جنت میں رہنے کی ممانعت ہوئی ؎

من ملک بودم وفردوس بریں جایم بود　　　آدم آورد درین دیر خراب آبادم

آئینۂ سکندر : مشہور ہے کہ آئینہ سکندر نے ایجاد کیا جو دریائے روم کے کنارے اسکندریہ کے بالائی منارہ پر آویزاں تھا۔ یہ آئینہ سو میل کی دوری سے انگریزوں وران کی کشتیوں کا حال بتایا کرتا تھا۔ ایک رات انگریزوں نے چوکیدار کو غافل پاکر اس کو پانی میں ڈالدیا اور اسکندریہ کو درہم برہم کر دیا۔ فارسی شاعری میں آئینہ اسکندر کبھی جام جم کے مترادف استعمال ہوتا ہے ؎

آئینہ اسکندر جام می است بنگر　　　تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

ارم یا ارم ذات العماد : مشہور ہے کہ شداد نے ایک ایسا باغ بنوایا تھا جو اپنی مثال آپ تھا اور وہ اس کو جنت کہتا تھا۔ قرآن شریف میں قوم عاد کے تذکرہ میں ہے "اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ"۔ فارسی شاعری میں اس سے مراد وہ باغ ہے جو بہت زیادہ پاکیزہ اور صاف ہو ؎

در گلستان ارم دوش چو از لطف ہوا　　　زلف سنبل ز نسیم سحری می آشفت

اَرِنِیْ : حضرت موسیٰؑ نے بارگاہ ایزدی میں یہ سوال کیا تھا "رَبِّ اَرِنِیْ" (اے میرے رب! اپنے آپ کو ظاہر کرتا کہ میں تم کو دیکھ سکوں)۔ جواب ملا "لَنْ تَرَانِیْ"

[1] گیہوں: قرآن مجید نے اسکی کوئی صراحت نہیں کی کہ وہ گیہوں کا درخت تھا۔

(تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے) لفظ اَرِنِیْ سے مذکورہ بالا واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے ؎

با تو آن عہد کہ در وادی ایمن بستم　　　ہمچو موسیٰ اَرِنِیْ گوئی بہ میقات بریم

اَلَسْتُ : قرآن شریف کی آیت "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کا پہلا لفظ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عالم ارواح میں تمام انسانوں سے اپنی خدائی کا عہد لیا تھا۔ اس تلمیح سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، یہ فارسی شاعری میں روز ازل کے معنی میں استعمال ہوا ہے ؎

برو ای زاہد و بر دردکشان خردہ مگیر　　　کہ ندادند جز این تحفہ بہ ما روز الست

انگشتری سلیمان : کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دست مبارک میں ایک انگوٹھی تھی جس میں اسم اعظم کندہ تھا۔ اس کی مدد سے وہ انسانوں اور جانوروں پر حکمرانی کرتے تھے۔ ایک دیو اس کو چرا لے گیا اور چالیس روز تک حکمرانی کے فرائض انجام دیتا رہا ؎

از ملک تو گر یابم انگشتری زنہار　　　صد ملک سلیمانم در زیر نگین باشد

اہرمن : قدیم ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق یہ ناپاکی اور تیرگی کا خدا ہے جو ہمیشہ نیکی کے خدا کے ساتھ برسرپیکار رہتا ہے۔ کبھی اہرمن سے مراد وہ دیو ہوتا ہے جس نے حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی چرا لیا تھا۔ ادبیات فارسی میں یہ شیطان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ؎

من آن نگین سلیمان بہ ہیچ نستانم　　　کہ گاہ گاہ در انگشت اہرمن باشد

ایاز : سلطان محمود کے ایک ترک غلام کا نام ہے۔ سلطان محمود اسکو بہت ہی محبوب رکھتا تھا۔ عقلمندی، زیرکی اور ملاحت میں یکتائے روزگار تھا۔

فارسی ادبیات میں اس کا ذکر سلطان محمود کے محبوب کے طور پر ہوتا ہے ؎

دست دل مجنوں وخم طرۂ لیلیٰ | پیشانی محمود وکف پای ایاز است

پدر : حضرت آدم صفی اللہ مراد ہیں ؎

نہ من از خلوت تقوی بہ در افتادم وبس | پدرم نیز بہشت از دست بہشت

پروین : فارسی میں ثریا ستارہ کو پروین کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ انگور کے خوشہ کے مانند ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کو فارسی میں خوشۂ پروین کہا جاتا ہے ؎

آسمان گو مفروش این عظمت کاندر عشق | خرمن مہ بہ جوی خوشۂ پروین بدو جو

پیر : خانقاہ میں ایک پیر طریقت ہوتا ہے جو اپنے مرشد سے سند یافتہ ہوتا ہے نیز شریعت وطریقت کے علم میں ید طولیٰ رکھتا ہے اور سالکوں کی ذہنی و روحانی تربیت کرتا ہے ؎

دوش از مسجد سوی میخانہ آمد پیر ما | چیست یاران طریقت بعد ازین تدبیر ما

پیراہن یوسف : اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کے لڑکے حضرت یوسفؑ کا پیراہن لے کر آرہے تھے تو دور ہی سے انکو اس پیراہن کی خوشبو محسوس ہوئی۔ قرآن شریف میں سورۂ یوسف میں یہ واقعہ مذکور ہے ؎

بوی پیراہن یوسف ز صبا می شنوم | شادی آور دو گل باد صبا شاد آمد

پیر کنعان : حضرت یعقوبؑ مراد ہیں ؎

شنیدہ ام سخنی خوش کہ پیر کنعان گفت | فراق یار نہ آن می کند کہ بتوان گفت

پیر مغان : پیشوائے طریقت و مرشد عارفاں مراد ہیں ؎

مشکل خویش بر پیر مغان بردم دوش | کو بہ تایید نظر حل معما می کرد

تاتار : ایک ملک کا نام ہے جہاں کا مشک بہت ہی مشہور ہے ؎

در آن چمن کہ نسیمی وزد ز طرۂ دوست | چہ جای دم زدن نافہ ہای تاتار است

ترک : ادبیات فارسی میں اس سے خوبرو اور زیبا مراد ہے ؎

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را | بہ خال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

جام جم : ایرانی داستان کے مطابق ایک جام ہے جو جمشید کے پاس تھا اور وہ اس جام میں پوری دنیا کو دیکھتا تھا۔ شاہنامہ کی روایت کے مطابق کیخسرو نے بیژن کے کام کی واقفیت کے لیے نوروز کے وقت اس میں دیکھا تو بیژن کو توران کے ایک کنوئیں میں قید دیکھا تو اس نے رستم کو اس کی رہائی کے لیے بھیجا ؎

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد | آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

جام جہاں بیں : جام جم ہی کو کہا جاتا ہے ؎

گفتم این جام جہان بین بہ تو کی داد حکیم | گفت آن روز کہ این گنبد مینائی کرد

جام جہان نما : جام جم ہی کا دوسرا نام ہے۔

جم : جمشید کا مخفف جم ہے۔ یعنی اس سے مراد جمشید ہے ؎

گفتم ای مسند جم جام جہان بینت کو | گفت افسوس کہ آن دولت بیدار بخفت

جمشید : پیشدادی کا ایک عظیم الشان تاجدار تھا۔ لباس سینا، کشتی رانی اور کھانا بنانا لوگوں سے سیکھا اور گوہر و موتی کو نکال کر ایک گوہر نشان تخت بنوایا۔ جشن نوروز کو اسی نے ایجاد کیا۔ اس کے پاس ایک ایسا جام تھا جس میں تمام

دنیا کو دیکھتا تھا۔ اس وجہ سے اس پر خود بینی اور خود ستائی غالب آگئی۔ آخر کار ضحاک اس پر غالب ہوگیا ؎

جمشید جز حکایت جام از جہان نبرد — زینہار دل منہ بر اسباب دنیوی

جوزا : صورت فلکی جبار کا یہ دوسرا نام ہے جس کی شکل اس شخص کے مشابہ ہوتی ہے جو کمر بستہ ہو اور ہاتھ میں شمشیر لیے ہو ؎

خوردہ ام تیر فلک بادہ بدہ تا سرمست — عقدہ در بند کمر ترکش جوزا فگنم

چار تکبیر : نماز جنازہ میں چار تکبیریں ہوتی ہیں۔ فارسی ادبیات میں چار تکبیر زدن یا گفتن کا استعمال ترک اشیاء کے طور پر ہوتا ہے ؎

من ہمان دم کہ وضو ساختم از چشمہ عشق — چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

چاہ یوسف : وہ کنواں جس میں حضرت یوسفؑ کو انکے بھائیوں نے ڈال دیا تھا ؎

ببین کہ سیب زنخدان او چہ می گوید — ہزار یوسف مصری فتادہ در چہ ماست

چشمۂ حیوان : آب حیات مراد ہے ؎

شاید کہ بہ آبی فلکت دست نگیرد — گر تشنہ لب از چشمہ حیوان بدر آیی

چگل : ترکستان کے ایک شہر کا نام ہے جہاں کے لوگ خوبصورتی اور زیبائی میں مثل کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

صفائی خلوت خاطر از آن شمع چگل جویم — فروغ چشم و نور دل از آن ماہ ختن دارم

حور : حوراء کی جمع ہے۔ قرآن شریف میں جمع استعمال ہوا ہے۔ فارسی میں مفرد استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد بہشت کی خوبصورت عورتیں ہیں ؎

صحبت حور نخواہم کہ بود عین قصور — با خیال تو اگر با دگری پردازم

خاتم سلیمان : انگشتری سلیمان ہی کو کہتے ہیں ؎

گرچہ شیرین دہنان پادشہانند ولی — او سلیمان زمان است کہ خاتم با اوست

خانقاہ : وہ جگہ جہاں سالکین حضرات عرفان و آگہی کے اعلیٰ مقام تک رسائی کے لیے تربیت حاصل کرتے ہیں اور صوفیہ حضرات عبادت، ریاضت اور تفکر میں مشغول رہتے ہیں ؎

منم کہ گوشۂ میخانہ خانقاہ من ست — دعای پیر مغان ورد صبحگاہ من ست

ختن : ترکستان کا ایک شہر جہاں کا مشک معروف ہے ؎

مژدگانی بدہ ای خلوتی نافہ گشای — کہ ز صحرای ختن آہوی مشکیں آمد

خرقہ : وہ لباس جو پیر و مرشد، سالکان طریقت کو عطا کرتے ہیں ؎

در خرقہ زن آتش کہ خم ابروی ساقی — بر می شکند گوشۂ محراب امامت

خسرو پرویز : ہرمز کا لڑکا اور نوشیرواں کا نواسہ اس کے باپ کو شورشیوں نے اندھا کرکے مار ڈالا اور اسے تخت پر بٹھایا۔ قیصر روم کی لڑکی اس کی منکوحہ تھی۔ تخت طاقدیس اور ایوان مدائن کی اسی نے بنیاد ڈالی۔ ادبیات فارسی میں خسرو شیریں کی داستان معاشقہ بہت مشہور ہے۔ فارسی شاعری میں اسکو شوکت و جلال کا نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے ؎

سپہر بر شدہ پرویزنی است خون افشان — کہ ریزہ اش سر کسری و تاج پرویز است

خلیل یا خلیل اللہ : حضرت ابراہیمؑ کا لقب ؎

یارب این آتش کہ بر جان من ست — سرد کن زانسان کہ کردی بر خلیل

(باقی)

اخبار علمیہ

الفرقان اسلامک ہیرٹیج فاؤنڈیشن، لندن کا ایک معروف علمی ادارہ ہے، اسلامی علوم و فنون کے مخطوطات کے جمع و تدوین میں اس نے قابل تعریف محنت کی ہے، ورلڈ سروے آف اسلامک مینوسکرپٹس کے نام سے اس نے چار ضخیم مجلدات کا جو منصوبہ تیار کیا وہ دنیا بھر میں اپنی قسم کا اولین منصوبہ ہے، مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے اسلامی مخطوطات کی مکمل و مفصل فہرست کتابیات کی جدید طرز کے مطابق مرتب کر کے ان کے متعلق قدیم و جدید معلومات زیادہ سے زیادہ فراہم کر دی جائیں اور جو مخطوطات زیادہ اہم ہوں ان کے بارے میں تفصیلات زیادہ ہوں، اس طرح ایک محقق کو بیک نظر ایک مخطوطہ کے متعلق مکمل واقفیت ہو سکے، اس عالمی فہرست مخطوطات کی دو جلدیں پہلے طبع ہو چکی ہیں، اب تیسری جلد کے شایع ہونے کی خبر ملی ہے اور عنقریب چوتھی اور آخری جلد بھی چھپ جائے گی، موجودہ تیسری جلد میں انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے سعودی عرب، سینیگال، سیرالیون، سنگاپور، سری لنکا، سوڈان، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، سیریا، تاجکستان، تنزانیہ، تھائی لینڈ، ٹوگو، تونس، ترکی، ترکمانستان، یوکرین، یو اے ای، یوکے، یو ایس اے، ازبکستان، ویٹیکن سٹی اسٹیٹ، یمن، یوگوسلاویہ وغیرہ ممالک شامل ہیں، ہر ملک کے سرکاری کتب خانوں کی جامع فہرست اور جائزہ کے بعد

انفرادی ذخیروں، ان کی قدر و قیمت، اسلامی مخطوطات کی کل تعداد، کتب خانوں کی تاریخ، ان تک رسائی کی داستان، موجودہ حالت، اور شایع شدہ، زیر طبع اور غیر شایع شدہ مخطوطات اور غیر مرتب نسخوں کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، آخر میں کتابیات، زبانوں اور ناموں کی فہرست بھی ہے۔

برطانیہ کے علمی حلقوں میں اس وقت مشہور دائرۃ المعارف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا بھی بڑا چرچا ہے، ۲۲۶ سال سے مسلسل شایع ہونے والی انگریزی زبان کی یہ قدیم ترین انسائیکلوپیڈیا ہے، اب اس کے مالکوں نے اس کے حقوق ملکیت فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، امکان ہے کہ اس کی فروخت سے وہ ۵۰۰ ملین ڈالر کی خطیر رقم حاصل کریں گے، اسکے لیے نیویارک کے ایک دلال ادارہ سے مناسب خریداروں کی تلاش کے لیے ربط قائم کیا گیا ہے، نیویارک ٹائمز نے گو خبر بڑے وثوق کے ساتھ شایع کی ہے، لیکن ادارہ کے ایک ترجمان نے اس کو غلط بتایا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا کی طرح مشہور انگریزی لغت کونسائز آکسفورڈ ڈکشنری C.O.D بھی اس وقت زیر بحث ہے، اس کا جدید اڈیشن شایع ہو رہا ہے، اس میں تقریباً سات ہزار الفاظ و اصطلاحات پہلی بار شامل کیے گئے ہیں جو زیادہ تر سیاست، کمپیوٹر اور بین الاقوامی طباخی سے متعلق ہیں، نئے الفاظ کی شمولیت سے انگریزی کے حامیوں کو بڑی تشویش ہے کہ ان نو وارد اجنبی الفاظ کی ملاوٹ سے کہیں ان کی زبان کا اصل رنگ مٹ نہ جائے، ان کی تنظیم کوئینز انگلش سوسائٹی کی ایک رکن این شیلے نے کہا کہ معیاری انگریزی وہ ہے جس کے ذریعہ نائیجیریا کا ایک بچہ گلاسگو کے ایک فرد سے بے جھجک گفتگو کر سکے، اب ایسا لگتا ہے کہ یہ معیار ختم کیا جا رہا ہے، نئے اضافہ میں امریکی

آسٹریلیائی، جاپانی اور نیوزی لینڈ کے خاصے الفاظ ہیں، معترضین کو ایسے الفاظ پر زیادہ ناگواری ہے جو ان کے نزدیک قطعی مہمل ہیں، مثلاً آفرنون کے لیے آسٹریلیائی لفظ ARVO کا استعمال کرتے ہیں، اب انگریزی زبان کی لغت میں اس کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح بعض عامی امریکی الفاظ پر بھی اعتراض ہے، شیلے نے کہا کہ امریکیوں نے چند کارآمد الفاظ ضرور دیے ہیں، لیکن ان کے بیشتر نئے الفاظ بدنما ہیں، ان سے انگریزی زبان کے حسن پر داغ آئے گا، لیکن ناشرین جنھیں معتدل مزاج بتایا گیا کا خیال ہے کہ ان الفاظ کو شامل کرکے انہوں نے غلطی نہیں کی ہے بلکہ یہ وقت کا تقاضا ہے اور وہ زمانہ کے ہم قدم ہیں، انگریزی زبان بھی تغیر و ارتقا پذیر ہے، وہ تو صرف اس کا اظہار کرتے ہیں، انکا مقصد یہ ہے کہ زبان جیسی ہے اسے لغت میں وہ اسی طرح شامل کردیں اور یہ کہنا کہ ہر تبدیلی ترقی نہیں ہوتی بلکہ محض تساہل تغافل کا نتیجہ ہوتی ہے صحیح نہیں کیونکہ موجودہ اصحاب قلم کی تحریروں سے ان الفاظ کے استناد و استعمال کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، پھر ذخیرۂ الفاظ کی وسعت و کثرت آج کے دور کی عکاس ہے، اس ساری بحث میں پرلطف بات یہ ہے کہ اردو زبان کے الفاظ پراٹھا اور رائتہ بھی اس میں شامل ہیں، شکر ہے کہ یہ قابل اعتراض نہیں ٹھہرے تاہم یہ سوال ضرور اٹھا ہے کہ ان الفاظ سے انگریزی زبان کے ذائقہ اور خوشبو میں اضافہ ہوگا یا ان کی گرمی و گدازی اور انکا چٹ پٹا ذائقہ انگریزی ذہن کے بگڑنے کا سبب تو نہ بنے گا؟

انگلستان کے نازک مزاج اہل زبان خواہ کچھ بھی کہیں، امریکیوں کا ذوق کام و دہن ان سے بہتر معلوم ہوتا ہے، گذشتہ دنوں امریکا کے صدر بل کلنٹن کی بیگم

ہندوستان کے دورہ پر آئیں تو ایک دلچسپ خبر یہ نظر سے گذری کہ ایک دن اچانک وہ تمام حفاظتی انتظامات کو پس پشت ڈال کر دہلی کے مشہور ہوٹل موریہ شیرٹن کے ریستوران "بخارا" میں جا پہنچیں اور اپنے مرغوب ماکولات سکندری ران، مرغ ملائی کباب، تندوری جھینگوں اور دال بخارا سے خود بھی شاد کام ہوئیں اور اعلیٰ امریکی افسروں کو بھی شریک لذت کیا، یہی نہیں انہوں نے بخارا کے خاص خانساماں اور طباخ منجیت سنگھ، کندن سنگھ اور بھاسکر سے ان کھانوں کی ترکیب بھی دریافت کی، ان کے لیے گو یہ مرحلہ سخت تھا، لیکن انہوں نے جس سلیقہ سے بزم تیموریہ کے ان باقیات کی تاریخ بیان کی وہ ان کے علم و فن کی داد و ستائش کی مستحق قرار پائی۔

ہوٹلوں اور ریستورانوں کی تاریخ میں فرانس کے کیفے، امتیازی اور افسانوی شان کے مالک ہیں، ایک زمانہ میں یہ فرانسیسی تہذیب و ثقافت کے گہوارے ادارے سمجھے جاتے تھے، دنیا میں سب سے پہلا کیفے ۱۵۵۴ء میں قسطنطنیہ میں قائم ہوا تھا، فرانس میں پہلے کیفے کا قیام ۱۶۷۲ء میں ہوا، اس طرح فرانسیسی کیفوں کی تاریخ تین سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے، فرانس کے مشہور فلسفی والٹیر کی زندگی میں بھی ایک کیفے کی خاص اہمیت ہے، اس صدی کا آغاز ان کیفوں کا دور عروج تھا، لیکن اب مغلئی کھانوں کے برعکس، فرانسیسی تہذیب و ثقافت کے یہ آئینے دھندلے ہوتے جارہے ہیں، ۱۹۶۰ء میں ان کی تعداد ۲ لاکھ تھی ۱۹۸۰ء میں ایک لاکھ بیس ہزار ہوئی اور اب یہ ۷۵ ہزار سے بھی کم رہ گئے ہیں، روایت پسندوں کی نظر میں اس زوال کے اسباب میں کھانے پینے کے بدلتے ہوئے پیمانے، گراں بازاری، ٹی وی اور امریکی طرز کے تیز رفتار کھانے وغیرہ شامل ہیں، ایک مشہور کیفے کے

مالک نے کہا کہ یہ جدید زندگی کا شاخسانہ ہے، لوگ اب دفتر سے گھر پہنچنے کیلئے اس قدر بے تاب رہتے ہیں گویا وہ اپنی بیرکوں میں واپس جا رہے ہیں، لیکن اس زوال پر گہری نظر رکھنے والوں کے خیال میں اصل سبب یہ ہے کہ خود ان کیفوں کے معیار میں گراوٹ آئی ہے، اب اشیا کی تیاری میں پہلی جیسی احتیاط نہیں رہی، پزا اور سینڈوچ کی روایتی، نفیس اور خوبصورت تھیلیاں نہیں رہیں، اب عام طور پر یہ پلاسٹک کی تھیلیوں میں رکھے جاتے ہیں۔

خورد و نوش کے سلسلہ میں ایک اور خبر نظر سے گذری کہ حال ہی میں اوسلو نا روے میں غذا سے متعلق متعدد اہم ممالک کے وزرا اور عالمی تنظیموں کے ذمہ داروں کی ایک گول میز کانفرنس ہوئی جو پیداوار اور صارفین کے متعلق مشرق و مغرب کے درمیان موضوع بحث و مناظرہ کی شکل اختیار کر گئی، بحث و مباحثہ کے جوش میں ترقی یافتہ ملکوں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مظاہرہ بڑے تلخ انداز میں ہوا، یہ چین کی غذائی پیداوار کا ذکر تھا، ادھر تین چار سالوں میں چین میں معاشی اصطلاحات کے نتیجہ میں فی نفر آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کے معیار زندگی میں تبدیلی بھی آئی ہے عالمی تنظیم ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کو یہ تبدیلی پسند نہیں اسکا کہنا ہے کہ چینی اب مرغ و ماہی، گوشت، انڈے، دودھ اور بیر کے عادی ہوتے جا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ امریکیوں کے مدمقابل بنتے جا رہے ہیں، مثلاً ۱۹۹۰ء میں ایک شخص پر جتنے انڈوں کا خرچ تھا ۲۰۰۰ء کے منصوبہ میں وہ دوگنا ہو گیا ہے اور یہ امریکیوں کے خرچ کے برابر ہے، اس ساری بحث میں سرمایہ دارانہ تخمینہ و حساب کا یہ دلچسپ نمونہ بھی سامنے آیا کہ چین میں ۲۰۳۰ء تک سالانہ ۲۶۰ بلین انڈوں کی

پیداوار کا نشانہ ہے، اب اگر ایک چینی مرغی سالانہ ۲۰۰ انڈے دیتی ہے (امریکی مرغی اوسطاً ۲۵۲ انڈے دیتی ہے) تو اس کے لیے چین کو ۱.۳ بلین مرغیوں کی ضرورت ہوگی اور ان کے لیے اسے ۲۴ ملین ٹن غلہ درکار ہوگا اور اتنا غلہ تو کناڈا ہر سال برآمد کرتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں چین میں غلہ کی قلت ہوگی، اس کا یہ غذائی 'بحران' عالمی فکر و توجہ کا سبب بنے گا اور مسئلہ یہ پیدا ہوگا کہ ان بھوکے چینیوں کا پیٹ کون بھرے؟ ان خیالات اور اندیشہ ہائے دور دراز پر چین کے وفد نے سخت ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنا پیٹ خود بھر سکتے ہیں، یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم دنیا کی سات فیصد قابل کاشت اراضی کے مالک ہیں اور دنیا کی ۲۲ فیصد آبادی کا پیٹ بھرتے ہیں، ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کے صدر یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ دنیا کی ۸۰ فیصد پیداوار اور توانائی کو سرمایہ دار ملکوں کے صرف ۲۰ فیصد لوگ ہضم کر جاتے ہیں، اگر چینیوں کا معیار زندگی بلند ہوا ہے تو کیا وہ صرف اسلیے قابل تنقید ہے کہ اس سے امریکیوں کی ہمسری ہوتی ہے؟

اس وقت دنیا کے ہیئت داں اپنی دوربینوں کا رخ سست رفتار سیارہ زحل کی جانب کیے ہوئے ہیں کیونکہ ان کو امید ہے کہ اس سیارہ کا چوڑا چکلا چھلا اب غائب ہونے والا ہے، یہ واقعہ قریب ہر ۱۵ سال کے بعد اس وقت رونما ہوتا ہے جب زحل گردش کے دوران زمین کی صف میں آجاتا ہے اسے RING PLANECROSSING سے تعبیر کیا جاتا ہے اس عالم میں اس کا ہالہ نہایت باریک اور معدوم سا ہو جاتا ہے، موجودہ گردش کے دوران یہ مشاہدہ ۲۲ مئی کو کیا گیا اور اب یہ ۱۰ اگست اور پھر آئندہ سال ۱۱ فروری کو ہو سکے گا، یہ تجربہ صرف ۲۴ منٹ کا ہوگا، لیکن اس دوران ایسے کئی چاند دیکھے جا سکیں گے جو عام طور پر زحل کی خیرہ کن روشنی کی وجہ سے خود اندھیروں میں گم رہتے ہیں۔ ع۔ ص۔

وفیات

مولانا انعام الحسن کاندھلوی مرحوم

امیر التبلیغ مولانا انعام الحسن کاندھلوی شنبہ ۱۰/ جون بروز عاشورہ محرم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

اس دور قحط الرجال میں ان کی وفات قوم و ملت کا بڑا جانکاہ حادثہ ہے، وہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کی مردم خیز بستی کے صدیقی شیوخ کے اس مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں کئی پشتوں سے اہل علم و فضل اور اصحاب رشد و ہدایت پیدا ہوتے رہے ہیں، شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلوی کے نامور و محبوب شاگرد مفتی الٰہی بخش اسی خاندان کے جد امجد تھے، اس خانوادے کے افراد حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد و احیائے اسلام میں بھی پیش پیش رہ چکے ہیں، علم و عمل کی اسی جامعیت اور بلند نظری و علوئے ہمت کی خاندانی روایت نے اس خاندان کو مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسفؒ کے سے داعیان حق بخشے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت، خلوص و للہیت اور تقویٰ و بے نفسی میں نمونہ سلف صالحین تھے۔

مولانا انعام الحسن صاحب مرحوم نے مولانا محمد الیاسؒ کے دامن عاطفت میں تربیت پائی، ان کے والد مولوی اکرام الحسن صاحب مرحوم نے جو مولانا الیاسؒ کے حقیقی بھانجے تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن اور قانون کی سند حاصل کی تھی، وہ ایک کامیاب وکیل تھے، لیکن اس پیشہ کو ترک کر کے انہوں نے مدرسہ

مظاہر العلوم کی خدمت کو اپنا مشغلہ بنا لیا، مولانا انعام الحسن صاحب ان کے اکلوتے صاحبزادے تھے یہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور خاندانی روایت کے مطابق پہلے کمسنی ہی میں قرآن مجید حفظ کیا اور اسی کمسنی میں وہ اپنے والد کے ہمراہ دلی مولانا الیاسؒ کی خدمت میں آ گئے، اپنے مربی سے مشکوٰۃ اور مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مولف حالات مشائخ کاندھلہ سے جلالین پڑھی، پھر مظاہر العلوم کے اساتذہ خصوصاً شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سے صحاح اربعہ کا درس لیا، مولانا محمد یوسفؒ شروع سے انکے ہم درس رہے، مظاہر العلوم سے واپسی کے بعد دونوں حضرات نے صحاح ستہ کی باقی کتابیں ابن ماجہ اور نسائی نیز اور کتب احادیث مولانا محمد الیاسؒ سے پڑھیں، جن سے بیعت وارادت کا تعلق بھی تھا۔ مظاہر العلوم کی طالب علمی کے زمانے ہی میں دونوں رفیقان درس کی شادی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی صاحبزادیوں سے ہوئی۔

مولانا انعام الحسن صاحب دلی میں بنگلہ والی مسجد کے مدرسہ میں تدریس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ اپنے مربی و مرشد کی تحریک اصلاح و تبلیغ سے وابستہ رہے، مولانا محمد الیاسؒ جب دیار عرب میں اپنی تحریک کو وسعت دینے کی غرض سے ۱۹۳۷ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے تو انکے مختصر قافلہ میں یہ بھی شامل تھے، مولانا الیاس صاحب کو ان کی صلاحیت و اہلیت پر اس قدر اعتماد تھا کہ وفات کے وقت انہوں نے جن چند حضرات کے نام امارت کے لیے تجویز کیے ان میں مولانا انعام الحسن کا نام بھی تھا، انکی معاملہ فہمی اور اصابت رائے کے سب ہی لوگ معترف تھے اسی لیے مولانا محمد یوسفؒ صاحب جب جماعت کے امیر منتخب ہوئے تو وہ ان کے مشوروں سے پورا فائدہ اٹھاتے رہے اور تبلیغی اسفار میں بھی انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جب آخر میں مولانا محمد یوسفؒ نے پاکستان کا سفر کیا جو انکا سفر آخرت بھی ثابت ہوا تب بھی

مولانا انعام صاحب انکے ساتھ تھے، مرض الموت میں مولانا یوسفؒ نے فرمایا کہ "بھائی ہماری منزل تو پوری ہو چکی" یہ سنکر مولانا انعام الحسن صاحب نے فرمایا کہ "ابھی کہاں ابھی تو آپ کو چین، روس امریکہ وغیرہ میں اسلام پھیلانا ہے" اس پر مولانا یوسفؒ نے کہا کہ "پالیسی مکمل ہو چکی اب کرنے والے کرتے رہیں گے"۔ ممکن ہے یہ اشارۂ غیبی رہا ہو کہ اب یہ بڑی ذمہ داری ان پر آنے والی ہے جو کوئی آسان کام نہیں تھا، مگر اس عالمگیر تحریک کی قیادت کے لیے جو علمی و عملی اوصاف و کمالات ناگزیر تھے وہ مولانا انعام صاحب میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے اسی لیے مولانا یوسفؒ صاحب کی جانشینی اور تبلیغی جماعت کی امارت کیلئے لوگوں کی نظر ان ہی کی جانب اٹھی اور وہ تیس سال تک اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، ایک زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ "جماعت کا دل اگر مولانا یوسفؒ ہیں تو دماغ مولانا انعام الحسن صاحب ہیں"۔ مگر بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ انکے دل میں بھی درد و سوز، تڑپ اور بے چینی کی وہی لہریں موجزن تھیں جو سیرت یوسفی کا طغرائے امتیاز تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنی امارت کے زمانہ میں جماعت کو اس کی خصوصیات و روایات پر قائم رکھتے ہوئے اسے اس عالمی مقام پر پہنچا دیا جو تحریک کے بانی اور انکے خلف الصدق کے تصور و خیال میں رہا ہوگا، وہ مولانا یوسفؒ کے ہم زلف تو پہلے ہی سے تھے مگر تحریک کو وسعت و ترقی دیکر انکے ہم سر بھی ہو گئے۔

انکے سانحہ انتقال پر ہم انکی اسی تلقین کو یاد کریں گے جو انہوں نے مولانا محمد یوسفؒ کے انتقال پر کی تھی کہ "انکا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ظاہری طور پر صورت پریشانی ہے لیکن حق تعالیٰ شانہ پر اعتماد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی محبت ان ظاہری صورتوں کا نعم البدل اور بدل حقیقی ہے"۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی قبر پر رحمتوں کی بارش فرمائے اور انکے صاحبزادہ والاتبار مولوی زبیر الحسن اور دوسرے متعلقین و پس ماندگان نیز پوری ملت کو صبر و رضا کی توفیق دے۔ آمین۔

ع۔ ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۶-۶-۹۵ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مئی ۹۵ء کے معارف کے اداریہ سے یہ جان کر کافی مسرت ہوئی کہ دار المصنفین کی علمی فضا کو پروان چڑھانے اور وہاں تحقیقی و تصنیفی کاموں کو مزید آگے بڑھانے کیلئے اس ادارہ کی مجلس انتظامیہ فکر مند اور کوشاں ہے اور اس سلسلہ میں اس نے جو فیصلے کیے ہیں وہ بلاشبہ اہم ہیں، لیکن اس علمی مرکز کے عام بہی خواہوں کا یہ احساس ہے کہ اس کے علمی و تحقیقی ماحول میں سرگرمی پیدا کرنے اور اس کے تصنیفی و تالیفی کاموں کو وسعت و ترقی دینے کے لیے اولین ضروری کام یہ ہے کہ پہلے کی طرح وہاں متعدد نئے رفقاء کو علمی و تصنیفی تربیت پر مامور کیا جائے اور اچھے اہل علم کی خدمات حاصل کی جائیں جو دار المصنفین میں رہکر اس کے مخصوص مزاج اور سانچہ میں ڈھل جائیں، یہی دار المصنفین کی تاسیس کا بنیادی مقصد ہے، پھر اس ادارہ کے مستقل رفقاء کو مزید فراغی و فارغ البالی کے ساتھ کام کرنے کا موقع عطا کیا جائے اس کے بغیر وہاں صحیح معنوں میں علمی ماحول کو گرم کرنا مشکل ہے۔ اداریہ میں مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے ذکر سے قبل آپ نے جو پس منظر بیان کیا ہے وہ خود اس احساس کو تقویت دے رہا ہے۔ کسی عارضی نظم سے کسی ادارہ کی علمی فضا کو مستقل طور پر گرم نہیں رکھا جا سکتا، مجلس انتظامیہ کو اس پر خاص طور سے غور کرنا اور توجہ دینا چاہیے "عارضی اسکالرس" کے علمی و تحقیقی کاموں کی نگرانی کے سلسلہ میں آپ نے لکھا ہے کہ یہ کام

"کسی بڑی علمی شخصیت" کے سپرد ہوگا، بہتر ہوگا کہ دارالمصنفین کے مستقل رفقاء میں سے کسی کو نگرانی کا کام سپرد کیا جائے اور اگر ان کی موجودہ مصروفیات اس میں حارج ہوں تو خاص طور سے اس کے لیے کسی "علمی شخصیت" کی خدمات مستقل طور پر حاصل کی جائیں، ورنہ باہر سے یا دور دیگر اسکالرس کی نگرانی میں بہت سی عملی دشواریاں پیش آئیں گی۔

اسکالرس کے لیے دائرہ کار کی تعیین کے سلسلہ میں اس جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ معارف میں اب تک شایع شدہ مضامین کے موضوعاتی اشاریہ کی تیاری اور کتابی صورت میں اس کی اشاعت نہایت اہم اور ضروری کام ہے، موجودہ دور میں اسکی بڑی اہمیت ہے، متعدد اردو اور انگریزی رسائل کتابی صورت میں اپنے مضامین کے موضوعاتی اشاریے شایع کر چکے ہیں لیکن معارف جیسے قدیم و موقر مجلہ کے اشاریہ سے طلبہ، اساتذہ و محققین اب تک محروم ہیں، اس لیے اس کام کو اولیت دی جائے جو ایک مفید علمی خدمت ہوگی۔

وزیٹنگ اسکالرس کی حیثیت سے اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت بہتر ہوگا کہ مدارس یا جامعات عربیہ کے استادوں کو ترجیح دی جائے، معروف مدارس میں باصلاحیت وصاحب فضل وکمال اساتذہ کی کمی نہیں، اعظم گڈھ و مئو تو اس باب میں کافی مشہور ہے۔

ماضی میں دارالمصنفین اور مدارس کے مابین بہت گہرے روابط رہے ہیں، یہ علمی وتحقیقی مرکز مدارس کے طلبہ واساتذہ کے لیے بالخصوص تصنیف و تالیف کی تربیت گاہ کی خدمت انجام دیتا رہا ہے۔

والسلام

ظفرالاسلام

مطبوعات جدیدہ

میں زندہ ہوں از جناب محمد ایوب واقف، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۱۹۲، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

یہ کتاب دس ادبی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں چند ادیبوں اور شاعروں کے خاکوں کے علاوہ غالب، نذرالاسلام اور مجروح کی شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے، ایک مضمون میں آل احمد سرور کی خودنوشت سوانح عمری پر تبصرہ ہے، بمبئی میں علامہ شبلی پر منعقدہ ایک سمینار کی روداد اور قتیل شفائی کے ساتھ ایک ادبی گفتگو بھی اس میں شامل ہے، مولف کو شکوہ ہے کہ اردو نثر میں جو کتابیں شایع ہوتی ہیں، ان میں شعر و شعراء پر توجہ زیادہ دی جاتی ہے اور نثر نگاروں پر کم، لیکن یہی شکوہ خود ان سے بھی ہے کہ اس کتاب میں بھی پلہ شعراء ہی کا بھاری رہا، عصمت چغتائی اور ظ۔ انصاری کے خاکوں کے علاوہ خود لائق مولف کی خود بیتی سب سے دلچسپ تحریر ہے، اس میں سادگی اور سلاست کی وجہ سے کشش اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے، علامہ شبلی سمینار کی روداد میں انہوں نے اس قسم کے سمیناروں کے ذمہ داروں کی توجہ جن امور کی جانب مبذول کی ہے وہ بیجا نہیں، ایک جگہ انہوں نے لکھا کہ "شبلی مرحوم نے ملک و ملت کے جس درد کو عمر بھر سینہ میں جگائے رکھا، اس درد کی سب سے بڑی آماجگاہ مولانا علی میاں کا

سینہ ہے"۔ البتہ ندوۃ العلماء کو انہوں نے کئی جگہ ندوۃ العلوم لکھا ہے۔

سوچ سمندر از جناب جمال قریشی، متوسط تقطیع بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۰، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: جمال منزل جمالپور، تانگہ اڈہ، احمد آباد گجرات۔

جناب جمال قریشی احمد آباد کے کہنہ مشق شاعر ہیں، گجرات میں نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے اردو شعر و ادب کی شمع روشن کر رکھی ہے، خود کہتے ہیں:

ہم نے گجرات کے بازار میں اردو تیرا　　سکہ اس طرح چلایا ہے کہ جی جانے ہے

اکیس برس پہلے انکا پہلا شعری مجموعہ جمال کدہ شایع ہوا تھا، اب یہ دوسرا مجموعہ ہے احمد آباد ایک عرصہ سے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جلتا رہا ہے، اس مجموعہ میں اسکی آنچ اور تپش صاف محسوس ہوتی ہے، یہ مجموعہ سخن کے قدردانوں کی پذیرائی کے لائق ہے۔

بنارس کی تاریخی مسجدیں از جناب سلام اللہ صدیقی، چھوٹی تقطیع کاغذ اور کتابت و طباعت مناسب، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۶، قیمت ۲۰ روپے پتہ: تنویر بک ڈپو ۱/۱۹، للہ پورہ، وارانسی، یوپی۔

اس مختصر کتاب میں بنارس کی مساجد ہی نہیں وہاں اسلام کی آمد علماء و صوفیہ کا قیام اور عہد بعہد مسجدوں درسگاہوں اور خانقاہوں کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے، بنارس کی پہلی مسجد مولف کی تحقیق کے مطابق مسجد ڈھائی کنگرہ ہے جو ۱۱۹۱ھ میں تعمیر ہوئی تھی، قدرتی طور پر مسجد گیان واپی کی تاریخ زیادہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے بابری مسجد کے بعد اب یہ بھی نشانہ پر ہے، اس کے متعلق یہ مفروضہ تاریخی طور پر قطعی غلط بتایا گیا ہے کہ اسے اورنگزیب نے بنوایا تھا، بلکہ ان سے پہلے سلطان ابراہیم شرقی کے عہد کے شیخ سلمان نے اسکی تعمیر کی تھی، کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اسے ہندی میں بھی شایع کرنا چاہیے۔

ع۔ ص۔